بچوں کی دنیا

جلد:2 شمارہ:11 دسمبر 2014

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل
NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبۂ ادارت: 11-49539009
ای میل
bachonkiduniya @ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،
نئی دہلی-110066
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com
'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر
بنام NCPUL شعبہ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب
امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں
شاخ: 22-7-110، فرسٹ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 6-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	4
نظم	وقت کی دعا	احمد وصی	5
کہانیاں	تتلی کا سفر	مناظر عاشق ہرگانوی	6
	کوڑے کا مکان	ادریس صدیقی	8
	...اور کوا اداس ہوگیا	تنویر اختر رومانی	10
نظم	سب بچوں جیسے ہو جائیں	جاوید اکرم	13
خاکہ	اتوار کی صبح	اقبال برکی	14
نظم	وہ بچپن کے دن بھی...	صبا ضمیر	17
آؤ دیکھیں	انڈین ریلوے میوزیم کی سیر	محمد خلیل	18
نظم	تعلیم	نور آفاق	25

سائنس کی الف لیلہ	شیشے کی کہانی	مترجم: انیس الدین ملک	28
کامکس	بھولے بھالو کی حماقتیں	ادارہ	33
مزاحیہ غزل	ہم اگر پڑھنے پڑھانے لگ جائیں	ظہیر قدسی	39
نظمی کا صندوق	آؤ کچھ ریل چلائیں	ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے	40
ڈرامہ	نابینا موسیقار اور ڈاکو	اقبال نیازی	42
قسط وار ناول	رابنسن کروسو	ڈینئل ڈیفو	46
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	54
بچوں کا اخبار	بچوں کی خبریں	ادارہ	56
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	58
اردو فیس بک	بچوں کی باتیں	ادارہ	61
انٹرنیٹ سے	الو کے منظر	ادارہ	62

آپس کی باتیں

پیارے دوستو، یہ ہم سبھی کے لیے بے حد خوشی کی بات ہے کہ اس سال کا نوبیل امن انعام بچّوں کی تعلیم پر زور دینے اور انھیں جہالت اور ظلم و زیادتی سے نجات دلانے کے لیے کام کرنے والی دو شخصیتوں کو دیا گیا ہے۔ یہ ہیں ہندوستان کے کیلاش ستیارتھی اور پاکستان کی ملالہ یوسف زئی۔ کیلاش ستیارتھی نے ہزاروں بچّوں کو بچّہ مزدوری سے نجات دلا کر اسکولوں میں داخل کرایا اور بچّوں کی بندھوا مزدوری کے خلاف طاقت ور تحریک چلائی جو اَب بھی جاری ہے۔ ہمارے ملک میں آج بھی لاکھوں بچّے ایسے ہیں جنھیں اسکول میں ہونا چاہیے لیکن وہ غریبی کی وجہ سے چائے خانوں، ڈھابوں، طرح طرح کی چھوٹی فیکٹریوں اور گھریلو صنعتوں میں یا گھریلو نوکر کی صورت میں کام کرنے پر مجبور ہیں، اور وہ بھی بہت معمولی اجرت پر۔ حالانکہ بچّوں کے لیے تعلیم لازمی کر دی گئی ہے اور بچّہ مزدوری کے خلاف سخت قانون بن چکا ہے پھر بھی غریبی ایک ایسی بیماری ہے جو والدین کو چھوٹے بچّوں سے کام کرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کیلاش ستیارتھی پیشے اور تعلیم سے الیکٹریکل انجینئر ہیں لیکن برسوں پہلے انہوں نے یہ پیشہ چھوڑ دیا اور پوری طرح سے غریب بچّوں کی تعلیم کے کام سے جڑ گئے۔

اسی طرح ملالہ یوسف زئی مسلم سماج میں لڑکیوں کی تعلیم کو اہم مقام دلانے کے لیے کام کر رہی ہیں جس کی وجہ سے انھیں گولیوں کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ عزیز دوستو یوں تو اسلام، پوری دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دینے والا وہ مذہب ہے جس میں تعلیم کو ہر مسلمان کے لیے فرض مانا جاتا رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسے لوگ بھی ہماری دنیا میں ہیں جو اسلام کے نام پر دہشت پھیلاتے ہیں اور لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے سے روکتے ہیں۔ ملالہ ایسے ہی لوگوں کے خلاف مسلم ملکوں میں خاص طور پر کام رہی ہیں اور ان کی عمر ابھی صرف 17 سال ہے۔ وہ نوبیل انعام کی تاریخ کی سب سے کم عمر اور دوسری پاکستانی شخصیت ہیں۔

نوبیل انعام کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو سویڈن کے سائنس داں اور صنعت کار الفریڈ نوبیل نے اپنے نام پر پانچ انعام شروع کرنے کی وصیت کی تھی، جس کے مطابق 1901 سے امن، ادب، کیمسٹری، فزکس اور طب یا میڈیسین کے شعبوں میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے لیے یہ انعام ہر سال دیا جانے لگا۔ البتہ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے دوران یہ پرائز نہیں دیا گیا۔ حالانکہ کئی مرتبہ اس کے لیے منتخب کیے گئے لوگوں پر اعتراض اٹھتے رہے ہیں پھر بھی آج اسے دنیا کا سب سے باوقار ایوارڈ مانا جاتا ہے۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والی دس شخصیتوں کو یہ انعام مل چکا ہے۔ پہلا نوبیل انعام الموڑہ میں پیدا ہوئے ہندوستانی شہری رونالڈ روس کو ملیریا کی بیماری کے خلاف کام کے لیے 1902 میں دیا گیا تھا۔ دوسرا انعام ممبئی میں جنم لینے والے جوزف رڈیارڈ کپلنگ کو ادب کے لیے 1907 میں ملا۔ تیسرا انعام گرودیو رابندر ناتھ کو ادب کے لیے 1913 میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح چندر شیکھر وینکٹ رمن کو فزکس کے لیے 1930 میں، ہرگوبند کھورانہ کو طب کے لیے 1968 میں، عمر کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارنے والی مدر ٹریسا کو امن کے لیے 1979 میں، سبرامنیم چندر شیکھر کو فزکس کے لیے 1983 میں، امرتیہ سین کو اکونومک سائنسز کے لیے 1998 میں، ٹرینیڈاڈ ٹوبیگو میں پیدا ہونے والے ہندوستانی مصنف وی ایس نائپال کو ادب کے لیے 2001 میں اور وینکٹ رمن راما کرشنن کو کیمسٹری کے لیے 2009 میں نوبیل انعام دیا جا چکا ہے۔

اچھا بھئی، نوبیل پرائز کی باتیں تو ہو گئیں، اب آپ اچھی اچھی کہانیاں، نظمیں اور مضمون پڑھیے اور ہمیں لکھیے کہ ان میں کیا آپ کو پسند آیا اور کیا پسند نہیں آیا! مگر دونوں کی وجہ ضرور بتائیے! آپ کا،

خواجہ محمد اکرام الدین

نظم

احمد وصی

وقت کی دعا

وہ کل جو کل بیت گیا
آج نہ اس کو یاد کرو
آنے والے کل کے لیے
نیا جہاں آباد کرو

آنے والا کل جس میں
بھائی چارہ الفت ہو
آنے والا کل جس میں
امن سکوں ہو راحت ہو

آج کو مت برباد کرو
ورنہ کل بن جائے گا
یعنی گذرے کل کی طرح
پھر نہ پلٹ کے آئے گا

آنے والا کل تم کو
آج صدائیں دیتا ہے
روشن مستقبل کے لیے
تمہیں دعائیں دیتا ہے

Mr Ahmed Wasl K-304, Hamjar Nagar,Pump House, Andheri (E) Mumbai-400093

کہانی

□ مناظر عاشق ہرگانوی

نیکی کا سفر

وہ غریب تھا اور اکیلا تھا، ادھر ادھر کام کر کے کسی طرح گذر بسر کر لیتا تھا۔

ایک دن پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھا وہ کوئی بات سوچ رہا تھا کہ ادھر سے ایک بزرگ کا گذر ہوا۔ اس نے بہت ادب سے بزرگ کو سلام کیا۔

انہوں نے اپنائیت سے پوچھا ''فکر مند کیوں ہو نوجوان؟''

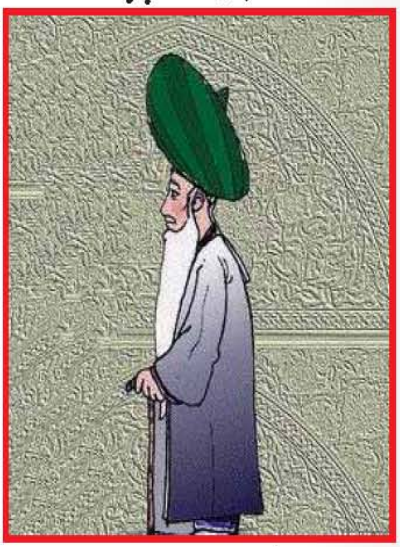

''پریشانی یہ ہے کہ میں بہت محنت کرتا ہوں پھر بھی بھر پیٹ کھانا نہیں ملتا۔ ایسا کیوں ہے؟'' نوجوان نے کہا۔

''اور محنت کرو... کامیابی محنت کے آگے جھکتی ہے۔'' بزرگ بولے۔

''اب اور کتنی محنت کروں؟''

''جب تک پیٹ بھر کھانا نہ ملے ڈٹے رہو۔ ویسے میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں؟''

''شکریہ جناب! لیکن مجھے مدد کی ضرورت نہیں ہے میں اپنی محنت کے سہارے ہی خوش رہنا چاہتا ہوں۔''

''بہت اچھا خیال ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم اتنی اچھی سوچ رکھتے ہوں۔ میرے پاس مال وزر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی جادو منتر ہے۔ میرے جھولے میں تھوڑا چنا ہے۔ ایک مٹھی تمہیں دینا چاہتا ہوں، یہ لو۔''

بزرگ نے ایک مٹھی چنے اسے دیے اور آگے کا راستہ پکڑا۔

چنے لے کر نوجوان خوب ہنسا۔ اس نے سوچا، بزرگ نے میری مدد کی بھی تو کیا، ایک مٹھی چنا۔

کام کی تلاش میں وہ آگے بڑھ گیا، ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک پیڑ پر بے حد خوبصورت چڑیا نظر آئی۔ وہ اسے پکڑنا چاہتا تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ اس نے جیب سے چنا نکالا اور چڑیا کو دکھلا کر زمین پر کئی چنے گرا دیے اور خود بھی زمین پر بیٹھ گیا۔ چڑیا چند لمحے اسے اور چنوں کو دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ پیڑ کی اس شاخ پر آ گئی جہاں سے نیچے آنا آسان تھا۔ نوجوان کو بے خبر سمجھ کر آخر چڑیا نیچے آ گئی۔ دو چار چنے چگنے کے بعد اس کے بالکل قریب پہنچ گئی، نوجوان اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اس نے جھپٹ کر چڑیا کو پکڑ لیا اور ایک سمت چل پڑا۔

جب وہ شاہراہ پر آیا تو کسی پرانے راجہ کی سواری جا رہی تھی۔

پیچھے ننھا راج کمار بھی تھا۔ نوجوان رک کر یہ جلوس دیکھنے لگا۔ اتفاق سے راج کمار کی نظر چڑیا پر پڑ گئی۔ اور وہ اسے لینے کے لیے مچل اٹھا۔ دو سپاہی نوجوان کے پاس آئے اور راج کمار کی خواہش ظاہر کی۔

نوجوان نے چڑیا دے دی جسے پا کر راج کمار بہت خوش ہوا اور اس نے تین سنترے اس کے پاس بھجوا دیے، نوجوان نے سنترے لے لیے اور آگے کا راستہ پکڑا۔

کچھ آگے جانے پر اس نے ایک بوڑھی عورت کو اپنے سامان کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ نوجوان کو اپنے قریب سے گذرتے دیکھ کر بڑھیا بولی "بیٹا! میں سخت پیاسی ہوں۔ میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔ اگر ہو سکے تو میری مدد کرو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا؟"

نوجوان شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ پانی کا انتظام کہاں سے کرے۔ دور دور تک کوئی کنواں یا تالاب اسے نظر نہیں آیا۔ تبھی اسے سنترے کا خیال آیا۔ اس نے سوچا، شاید اس سے بوڑھی عورت کی پیاس بجھ جائے۔

بڑھیا کی جان میں جان آئی۔ سنترے سے اس کی پیاس بجھ گئی۔ اس نے نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔ اسے دعائیں دیں اور کپڑے کے تین تھان دیے کیوں کہ وہ کپڑے کی ہی تاجر تھی۔

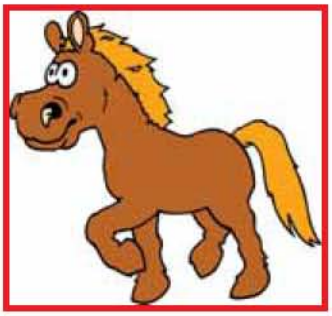

نوجوان پھر آگے بڑھ گیا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس نے ایک گھوڑے کو زمین پر پڑا پایا۔ تین آدمی اسے گھیرے بیٹھے تھے۔ لگتا تھا گھوڑا مر گیا ہے۔ نزدیک جا کر نوجوان نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ بولے "ہم اس گھوڑے پر سامان لاد کر چل رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہوا۔ یہ گر پڑا۔ اب اٹھتا ہی نہیں۔"

نوجوان سوچنے لگا، جب تین ہٹے کٹے کچھ نہیں کر پائے تو وہ کون سا تیر مار لے گا۔ پھر بھی وہ گھوڑے کے پاس گیا اس کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں اسے عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ وہاں بے بسی تھی اور التجا تھی۔ نوجوان سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ ان تینوں سے بولا "اگر چاہو تو یہ گھوڑا مجھے بیچ سکتے ہو، میرے پاس قیمتی کپڑے کے تین تھان ہیں۔ بدلے میں لے لو۔"

وہ فوراً راضی ہو گئے۔ انہوں نے گھوڑا نوجوان کے حوالے کر دیا اور تھان اور اپنا سامان لے کر راستے پر ہو لیے۔

ان کے جانے کے بعد گھوڑا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ وہ بوجھ سے مرا جا رہا تھا۔ اب بوجھ ہٹتے ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ نوجوان خوش خوش اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ کافی آگے جانے پر اسے ایک عالی شان مکان نظر آیا۔ مکان کے سامنے ایک آدمی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے نوجوان کو روکا۔ وہ گھوڑے سے اتر کر اس کے پاس آیا۔

"کہیے!" نوجوان نے اس سے پوچھا۔

"دیکھو نوجوان! میں اس مکان کا اور اس کے آس پاس کے کھیتوں کا مالک ہوں۔ میرے خاندان کے سبھی لوگ شہر میں رہتے ہیں۔ میں یہاں سال میں بس دو ایک بار آتا ہوں۔ آج صبح خبر ملی کہ میرا لڑکا سخت بیمار ہے۔ سامنے میری گاڑی دیکھ رہے ہو، یہ خراب ہو گئی ہے، اور وہ ٹریکٹر بھی خراب پڑا ہوا ہے۔ جو آدمی خبر لے کر شہر سے آیا تھا اسے میں نے کسی میکینک کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔ دو گھنٹے ہو گئے ابھی تک نہیں لوٹا۔ کیا تم مجھے اپنا گھوڑا دے سکتے ہو تا کہ میں شہر جا سکوں؟"

نوجوان نے سوچا، مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے اور اس نے گھوڑا مکان مالک کو دے دیا۔

جاتے وقت اس نے مکان کی چابی نوجوان کے حوالے کرتے ہوئے کہا "زمین جائداد کی دیکھ بھال تم کرنا، اور جب تک چاہو یہیں اسی مکان میں رہنا۔"

نوجوان اب وہیں رہ رہا ہے۔ □

Dr Manazir Ashiq Harganwi Kohsar Bheekanpur -3, Bhagalpur- 812001

کہانی

ادریس صدیقی

کوڑے کا مکان

حکیم مرزا بہت تیز آدمی ہیں۔ بالکل چلتا پرزہ۔ انھوں نے مکان کے لیے زمین خریدی۔ وہ بھی تالاب جیسے گڈھے میں ہے۔ اپنی بیوی شائستہ اور بیٹے جاوید کو دکھاتے ہوئے فخر سے بولے:

''میں نے یہ زمین بہت سستی خریدی ہے، ورنہ یہاں زمین کا دم چار گنا زیادہ ہے۔''

لیکن بیوی نے منہ بناتے ہوئے کہا ''یہاں تالاب بنانا اچھا رہے گا۔''

''تم گڈھے پر دھیان نہ دو، جب یہ بھر دیا جائے گا تو دوسری زمینوں سے فرق کرنا مشکل ہوگا۔''

''لیکن اس گڈھے میں مٹی بھروانے پر بہت خرچ آئے گا۔ پھر کیا عقل مندی ہوئی؟''

''تم نے مجھے کیا بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟ میں گڈھے کو پہلے کوڑے کرکٹ سے پاٹ دوں گا۔ پھر زمین برابر ہونے پر تھوڑی مٹی ڈالنے سے کام چل جائے گا۔'' مرزا کی کھوپڑی بہت تیز چلتی ہے۔

یہ سنتے ہی دس برس کا بیٹا جاوید ہنسنے لگا۔ ''پاپا! کوڑے پر مکان بنوائیں گے۔''

''بیٹا! آج کل زمین کوڑے سے برابر کرتے ہیں۔ پھر پتہ بھی نہیں چلتا کہ زمین کے نیچے کیا ہے؟'' مرزا نے نادان بیٹے کو سمجھایا۔

شائستہ بھی جانتی تھی کہ بھلا مرزا کو کون سمجھا سکتا ہے؟

شہر کے باہر کوڑے کا اتنا بڑا میدان ہے کہ ایک بستی بن جائے۔ یہاں ہر محلّہ سے کوڑا لاتے ہوئے ڈھیر کر دیا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے کوڑے کا پہاڑ نظر آنے لگا۔ اس جگہ کوڑا نہ صرف جمع ہوتا ہے بلکہ بعد میں بنتا بھی ہے۔ کتنے ہی کسانوں نے اپنے کھیتوں میں کوڑے کو کھاد سمجھ کر وہاں ڈالنا شروع کر دیا۔

''سڑک بنانے میں آس پاس کی مٹی کھودتے ہیں۔ پھر ان گڈھوں کو کوڑے سے بھر دیتے ہیں۔'' حکیم مرزا نے کوڑا استعمال

کرنے کے بارے میں بتایا۔

''تم جانو اور تمہارا کام جانے۔'' یہ کہہ کر شائستہ نے اپنا پلہ جھاڑ لیا۔

مرزا نے کئی ٹریکٹر ٹرالی بھر کر کوڑا اٹھوایا۔ اس میں زیادہ تر گھریلو کوڑا تھا۔ دھول، کاغذ، دفتی، پلاسٹک، دھات کے ٹکڑے اور پلاسٹک کی چھوٹی بڑی تھیلیاں ہر گھر کے کوڑے کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہ کوڑا ڈالنے سے کچھ ہی دنوں میں مرزا کی زمین کا گڈھا بھر گیا۔

''اتنی گندگی اور بدبو جھیلنا میرے بس کی بات نہیں۔'' مرزا کی بیوی نے صاف کہہ دیا۔ وہ شائستہ کو بھرا ہوا گڈھا دکھانے لائے تھے۔

مگر مرزا اسے اپنا کارنامہ ثابت کرنے پر تلے تھے۔

''ایک برسات میں کوڑا بیٹھ جائے گا۔ پھر مٹی ڈالی جائے گی...'' مرزا بتانے لگے۔

تبھی جاوید نے جوڑ دیا۔ ''اور زمین برابر ہو جائے گی۔''

''بالکل! اور ابھی بھی ہماری یہ زمین ہمیں آدھے داموں پر پڑ رہی ہے۔''

مرزا پیسہ بچانے کی جگت میں ہیں یہ سبھی سمجھتے تھے۔

اگلے ہی دن کوڑے کی تہوں پر مٹی ڈالی گئی اور مکان بنانے کی شروعات ہوگئی۔ مرزا نے بڑی تیزی سے مکان بنوایا۔ وہاں کافی مکان آباد ہو چکے تھے اس لیے اب وہاں رہنے میں شائستہ اور جاوید کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کافی کھلی جگہ تھی اور میدان بھی تھا۔ جاوید کا کرکٹ کھیلنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔

ابھی انھیں نئے مکان میں رہتے ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اچانک وہ ہو گیا جو بالآخر ہونا ہی تھا۔

حکیم مرزا اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ شائستہ بازار گئی تھی۔ جاوید ابھی اسکول میں تھا۔ لیکن جب شائستہ گھر واپس آئی تو اپنے مکان کے پاس بھیڑ لگی دیکھی، وہ پریشان ہوگئی۔ بھیڑ کو چیرتی ہوئی وہ گھر کے قریب پہونچی۔

اس کے منہ سے نکلا، ''یا اللہ خیر!''

مکان کی ایک دیوار بیٹھ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے چھت بھی ترچھی ہوگئی۔ شائستہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ اس نے جلدی سے حکیم مرزا کو خبر بھیجی۔ وہ بھی بھاگے بھاگے پہونچے۔ ان کے پڑوسی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''مرزا تم نے تو اچھی سیمنٹ اور اینٹیں استعمال کیں۔ پھر مکان کیسے بیٹھ گیا؟'' ایک نے پوچھا۔

حکیم مرزا چپ! کہیں تو کیا کہیں؟ چالاک تو تھے ہی۔ لہٰذا بات خود ہی سمجھ میں آ رہی تھی۔ گڈھے کو کوڑے سے پاٹا گیا تھا۔ اس میں پلاسٹک اور پولی تھین کے ٹکڑے بھرے پڑے تھے۔ دھیرے دھیرے کوڑا بیٹھنے لگا۔ اس کی وجہ سے دیوار کے نیچے بنیاد بھی کھسک گئی۔ پھر تو مکان کو گرنا ہی تھا۔

لوگوں نے حکیم کے مکان سے سبق لیا۔ کسی نے بھی کوڑے سے بھروانے کے بعد زمین پر مکان نہیں بنایا۔

جاوید آج بھی پاپا سے کہتا رہتا ہے۔

''پاپا کوڑے کا مکان ایک دن کوڑا ہی بن جاتا ہے۔''

حکیم مرزا کی چڑھ بن گئی۔ کوڑے کا مکان! □

Mr Idris Siddiqi
40 Whitelease Avenue,
Scarborough ONTARIO M1B 1W7, Canada

کہانی

تنویر اختر رومانی

...اور کوّا اداس ہو گیا

کٹ کٹ مرغی آنگن میں اپنے آٹھ چوزوں کے ساتھ گھوم رہی تھی کہ اچانک دیوار پر کوّا آ کر بیٹھ گیا اور ''کاؤں... کاؤں'' کرنے لگا۔ اس کی تیز آواز سنتے ہی کٹ کٹ کے سارے بچے گھبرا کر اپنی ماں کے پنکھوں میں دبک گئے۔ کٹ کٹ کا موڈ بگڑ گیا۔ اس نے گھور کر کوّے کو دیکھا اور ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''کیا بے وقت کا راگ الاپتے ہو؟ جب دیکھو تب یہیں مرنے چلے آتے ہو۔ اور کوئی جگہ نہیں ملتی تمھیں.. صبح آتے ہی کاؤں کاؤں کر کے سارا موڈ چوپٹ کر دیتے ہو۔''

کٹ کٹ کو غصے میں دیکھ کر کوّا سہم گیا۔ خود مرغی کی آواز بھی کچھ کم بری نہیں تھی پھر بھی کوّے نے نرمی سے کہا۔ ''میں نے کیا کیا ہے کٹ کٹ بہن؟''

''یہی کیا کم ہے کہ صبح صبح اپنی منحوس صورت اور منحوس آواز کے ساتھ پہنچ جاتے ہو۔''

''میں منحوس ہوں بہن؟'' کہتے کہتے کوّا اداس ہو گیا۔

''اور نہیں تو کیا!... پتا نہیں اللہ نے

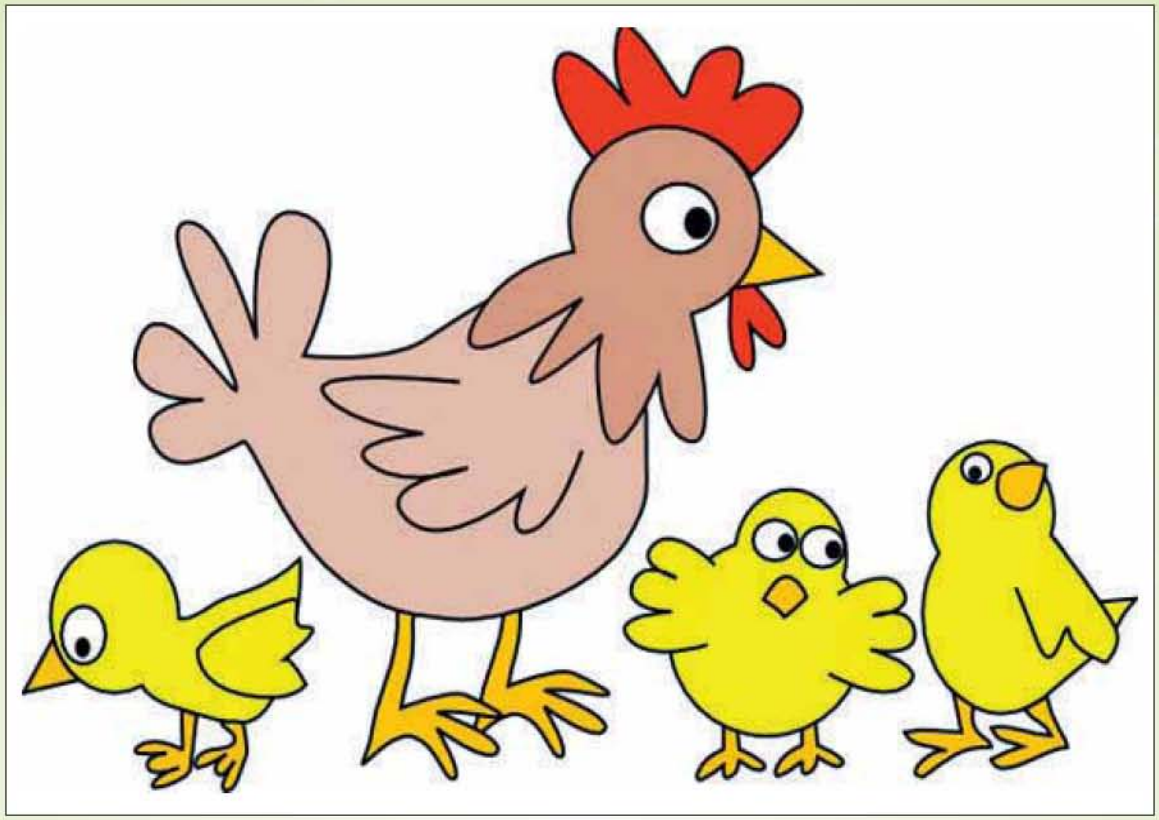

تمہیں کیوں بنایا ہے؟ نہ رنگ نہ صورت، نہ آواز، نہ فائدہ... مجھے دیکھو ، میں انڈے دیتی ہوں جنھیں لوگ کھاتے ہیں اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور انسان انھیں بہت سے کاموں میں استعمال کرتا ہے۔ اور تم؟... تمہارا کیا کام ہے؟ بس کاؤں کاؤں کرنا۔'' کٹ کٹ نے غرور سے گردن اکڑا کر کہا اور بچوں کے ساتھ آنگن میں ٹہلنے لگی۔

''میں... میں...'' غم کی شدت سے کوّے کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ''میں لوگوں کو سویرا ہونے کا پتا دیتا ہوں۔''

''ہونہہ!... یہ کام تو ان کے ابو جان کرتے ہیں۔'' کٹ کٹ نے اپنے چوزوں کی طرف گردن گھما کر کہا۔

''میں کوئل کے انڈے سیتا ہوں۔'' کاگا نے کہا۔

''یہ تو تمھاری اپنی بے وقوفی ہے، کوئی جان بوجھ کر تھوڑے ہی ایسا کرتے ہو۔''

'بے وقوف' کا طعنہ سن کر کوّے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میں لوگوں کو خط یا مہمان کے آنے کی خبر دیتا ہوں۔''

''وھت !... دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہوگئی ہے اور تم ہو کہ اب بھی دقیانوسی بات کرتے ہو۔ چار دن پہلے بھی تم نے آ کر کاؤں کاؤں کیا تھا۔ کہاں کوئی خط یا مہمان آیا؟... آخر ہو نہ بے وقوف کے بے وقوف۔''

کہہ کر کٹ کٹ آنگن میں گھوم گھوم کر دانا چگنے لگی۔ اس کے بچے بھی آگے پیچھے گھومتے رہے۔

کٹ کٹ کی دل توڑنے والی باتوں سے کوّا رو پڑا۔ وہ وہاں سے اڑنے ہی والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک چیل اچانک کٹ کٹ کے بچوں کی طرف جھپٹنے والی ہے۔ یہ دیکھ کر کوا بڑی تیزی سے چیل کی طرف لپکا اور پوری طاقت سے ''کاؤں کاؤں'' کرنے لگا۔ اس کی آواز سن کر آناً فاناً نہ جانے کہاں سے اور بھی کوّے آگئے اور اسی طرح کاؤں کاؤں شور مچانے لگے۔ اس حملے سے چیل گھبرا گئی اور بھاگ پڑی۔ کوّے نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ جب اس نے سمجھ لیا کہ چیل ادھر آنے کی ہمت نہیں کر سکتی تو وہ واپس کٹ کٹ کے پاس پہنچا۔

''بچوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا؟'' کوّے نے نرمی سے پوچھا

''نہیں کوّے بھائی، تم نے میرے بچوں کو بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اسے کبھی نہیں بھول سکتی.... تم بہت اچھے ہو۔''

''نہیں بہن... میں واقعی بدصورت ہوں... بے وقوف ہوں۔'' کوّے نے دکھی آواز میں کہا۔ اس کی بات پر مرغی اور شرمندہ ہوگئی۔

''اب اور شرمندہ نہ کرو کوّے بھیّا۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ خدا نے سب کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ضرور رکھی ہے۔ میں نے جان لیا کہ اچھا وہی ہے جو مصیبت میں دوسروں کے کام آئے اور برا وہ جو غرور اور تکبر کرتا ہے۔ آج سے میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔''

یہ سن کر کوّا خوشی سے چلایا ''کاؤں کاؤں''۔ چوزے بولے ''چوں چوں...'' کٹ کٹ بھی خوش ہو کر آنگن میں ناچنے لگی۔ ◻

Mr Tanweer Akhtar Roomani : Place & P.O. Azadnagar, Jamshedpur-831012.

نظم

جاوید اکرم

سب بچوں جیسے ہوجائیں

بڑے نہیں یہ بچے ہیں
اسی لیے تو اچھے ہیں

بہتے پانی جیسے ہیں
رات کی رانی جیسے ہیں

جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں
چوری کرتے ڈرتے ہیں

جھٹ پٹ اپنا کام کریں
پھر کھیلیں، آرام کریں

پل دو پل کو روٹھتے ہیں
خوب مزے پھر لوٹتے ہیں

لڑے بھڑے سب بھول گئے
بانہوں میں پھر جھول گئے

بڑے بھی کاش ایسے ہوجائیں
ان بچوں جیسے ہوجائیں

Mr Javed Akram Kendriya Vidyalaya IIM, Prabandh Nagar, Lucknow-226013

خاکہ

اقبال برکی

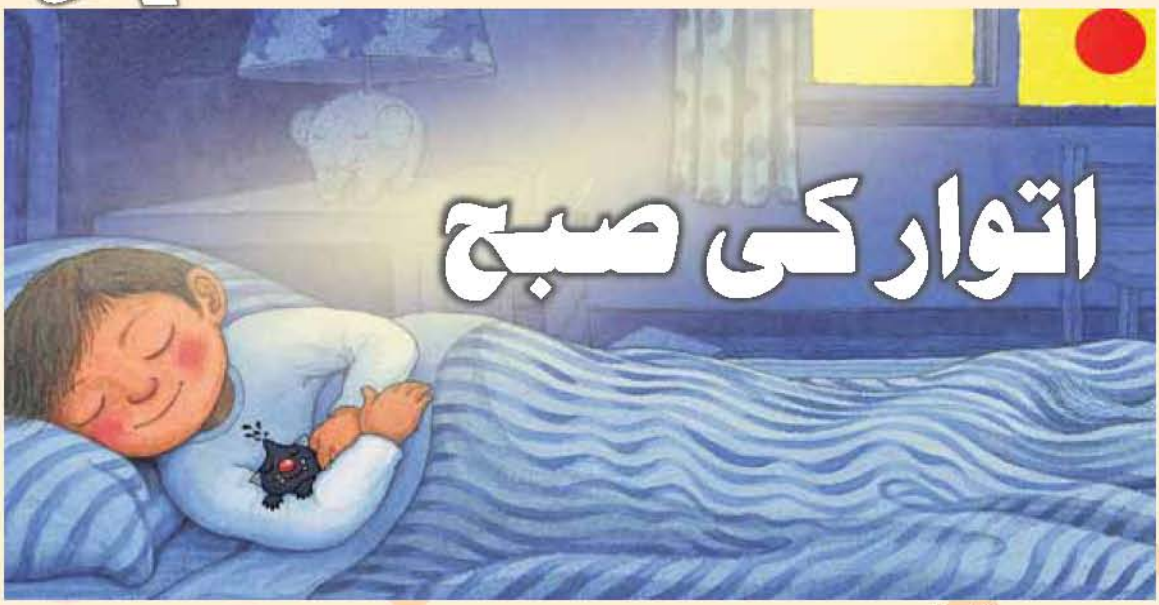

اتوار کی صبح

شامت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ آتی ہے تو حماقتوں، آفتوں، مزید حماقتوں اور مصیبتوں کا میلا جھمیلا بھی ساتھ لاتی ہے۔ آصف کی شامت بھی میلوں جھمیلوں کے ساتھ آئی تھی اور اس کی اچھی بھلی اتوار کی چھٹی اور چھٹی کی نیند غارت کر گئی۔ سنیچر کی شام سے ہی اُس نے رٹ لگا دی تی، ''جگانا مت، کل دیر تک سوؤں گا۔'' اُسے کیا معلوم کہ منصوبہ اور منصوبوں کی ترتیب و ترکیب انسان بناتا ہے اتفاقات ان کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ ممی نے، پاپا نے اور گڑیا نے بھی بار بار اُسے یقین دلایا تھا اور بار بار یہ وعدہ کیا تھا کہ اُسے نہیں جگائیں گے اور وہ جتنا چاہے سو لے۔ مگر ممی نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ خود نہیں جاگیں گی۔ ممی معمول کے مطابق سویرے یعنی فجر کی اذان کے ساتھ بیدار ہوئی تھیں۔ نماز و تلاوت سے فارغ ہوئیں۔ پاپا کو جلدی چائے کی طلب لگتی تھی، اس لیے اسٹو پر چائے رکھی اور دوسرے کام بھی نمٹاتی رہیں۔ پاپا چائے پی کر اخبار

مصنف کی اس تحریر میں کہانی تو کوئی نہیں ، البتہ ایک معصومیت بھرا ماحول ضرور ہے، اس لیے آپ بس اُسی کا لطف لیں... کہانی نہ ڈھونڈیں۔ اعزازی مدیر

دیکھتے رہے۔ تب تک ممی ناشتہ بناتی رہیں۔ نمازِ فجر کے بعد سورج ٹھہرتا کہاں ہے۔ وہ بھی اُجالا آگے آگے دوڑاتا ہوا رینگتا، کھسکتا آخر باہر جھانکنے لگا، اور پھر اُچھل کر اُوپر آ گیا۔ کچن میں دھوپ آئی۔ پلنگ کے اُوپر بندھی ڈور پر تولیہ لٹک رہا تھا۔ پانی کا ایک قطرہ اس کی کہنی کی طرف بھاگا۔ نیچے دیکھا۔ لپکا اور سیدھا آصف کے کان میں جا بیٹھا۔ کان میں اُترنے والے پانی کے قطرے سے سویا ہوا آدمی کیا مردہ بھی اُٹھ بیٹھے۔ آصف بھی ہڑبڑایا اور کان میں انگلی ٹھونس کر کلبلاتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ وہ منمناتا، بڑبڑاتا رہا۔ نیند کے خمار اور غصّے کی آگ نے صورت بگاڑ دی۔ ایسی بگڑی صورت پر تو سب کو ہنسی آتی ہے۔ ممی پاپا ہنسے تو کیا ہوا؟ لیکن گڑیا کی ہنسی

نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ آصف کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ مگر کرے کیا؟ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ بدبداتا، بڑبڑاتا جھٹک پٹک کرتا، پاؤں پٹکتا سیدھا باتھ روم میں جا پہنچا۔ واپسی پر فیصلہ کر آیا تھا کہ کچھ بھی ہو، ابھی اور سوؤں گا۔ لیکن یہ کیا... یہاں تو بستر ہی گول ہو چکا تھا۔

فیصلہ تو آخر فیصلہ تھا۔ منہ پھلائے بغیر کچھ کہے اسی جگہ پلنگ کے نیچے ننگے فرش پر پاؤں پسار کر پڑ رہا۔ جلد ہی وہ پھر سو گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بیٹھ کر وہ اپنا ہوم ورک کرتا تھا اور جب جی چاہتا کمر سیدھی کر لیا کرتا تھا۔ اکثر یہ کمر دو دو گھنٹے تک سیدھی ہوتی تھی۔ کتابیں بیاضیں پین پنسل سب پلنگ کے نیچے کھسکا دی جاتی تھیں۔ کمرے کے فین سے ان کتابوں اور بیاضوں کے اوراق کھڑکھڑاتے تھے اور آصف کو لوری سناتے تھے۔ اسی جگہ کل رات میں ہی اُس نے اپنی ڈرائنگ میں رنگ بھر کر اُسے بھی پلنگ کے نیچے کھسکا دیا تھا۔ لیٹتے لیٹتے ایک نظر ڈرائنگ کی کھلی بیاض پر بھی ڈال لی تھی۔ رنگ خشک ہو چکے تھے۔ ڈرائنگ اچھی اور خوبصورت لگی تھی۔ مگر نیند ڈرائنگ سے زیادہ اچھی تھی۔ اطمینان سے آنکھیں موندی اور ذرا دیر میں دوسرے خواب کے اُڑن کھٹولے پر سوار ہو کر پہلے خواب کو تلاش کرنے نکل گیا۔

ابھی اس کے دوسرے خواب کے اُڑن کھٹولے نے کتنی منزلیں طے کی تھیں، کتنے دریا پار کیے تھے اور کتنے میدانوں اور پہاڑوں کو عبور کیا تھا کوئی نہیں جانتا۔ مگر ایک بار پھر اس کے چہرے پر ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹے پڑے۔ خوابوں کا اُڑن کھٹولہ ایک بار پھر اُڑن چھو ہو گیا۔ نندیا رانی پھر شرما کر بھاگ گئی تھی۔ مگر وہ بھی ضدی تھا۔ اس نے بھی آنکھیں بند رکھیں اور یوں ہی پڑے پڑے بدبدایا، ''ممی!'' ساتھ ہی بلا ارادہ اس کی دائیں ہتھیلی چہرے کے ٹھنڈے چھینٹوں کو پونچھنے صاف کرنے کے لیے چہرے پر دوڑی تھی۔ ابھی اس نے ہاتھ ہٹایا بھی نہیں تھا کہ گڑیا کے کھلکھلا کھلکھلا کر بے تحاشہ ہنسنے کی آواز آئی تھی۔ آصف اور گڑیا دونوں میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ ہلکی سی آواز بھی دونوں کے لیے زہر تھی۔

اب ایسی بے تحاشہ ہنسی اور اُوپر سے گڑیا کا جملہ، ''امی بھیا کا منہ تو دیکھو...'' اور اُس کے بعد پھر وہی بے تحاشہ ہنسی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آصف کیسا تلملایا ہوگا۔ گڑیا نے تو امی کو مخاطب کیا تھا اور پھر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی تھی۔ آصف بلبلا کر اُٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھولتے ہی جو منظر دیکھا وہ اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا۔ ایسا جھلایا اور ایسا بھنّایا کہ بس دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ہوا یوں کہ خوابوں کا اُڑن کھٹولہ

اُڑاتے اُڑاتے اُس کا ایک ہاتھ پلنگ کے نیچے رکھی رنگ کی ٹرے پر جا پڑا تھا۔ اس کا ہاتھ ٹرے پر پڑتے ہی ٹرے کی کلیوں کے سارے رنگ مچلے، بھنائے اور اُڑتے ہوئے سیدھے آصف کے چہرے اور اس کے آس پاس جم گئے تھے۔

اُس نے پاپا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ امی تو پہلے ہی گڑیا کا ساتھ دے رہی تھی۔ دونوں کو اس طرح ہنس ہنس کر دوہرا ہوتے دیکھا تو آصف اور زیادہ آگ بگولہ ہو گیا۔ چاہتا تو نہیں تھا مگر نظر آئینے کی طرف اُٹھ ہی گئی۔ چہرے پر بننے والے بے ہنگم نقشے کی اسے امید نہ تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اس کے ہی بنائے ہوئے رنگ اس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ وہ جھلا کر پاؤں پٹختا وہاں سے نکلا اور سیدھا باتھ روم میں جا کر رکا۔ نلکا کھول خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھونے لگا۔ مگر رنگ تو بے ہودہ، بے شرم اور ڈھیٹ ہوتے ہی ہیں کہ ذرا توجہ ہٹی یا ان سے لاپرواہی برتی گئی تو اپنے رہتے دم تک مذاق اڑاتے ہیں۔ ان رنگوں کو بھی جگہ چھوڑ کر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ بھی ڈھیٹ ہی ثابت ہو رہے تھے۔ آصف پانی سے چہرہ دھو کر واپس چلا آیا۔

آصف کے چہرے پر جمے رنگوں کو دیکھ کر ممی بولیں، ''بیٹا صابن لو اور جا کر نہاؤ۔''

گڑیا نے ٹکڑا لگایا۔ بولی، ''پہلے دانت صاف کرو۔''

آصف گڑیا کو جواب نہ دے۔ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بولا، ''دانت صاف کیے بغیر تو ہی کھاتی ہے۔ آئینہ دیکھ۔ ہلدی کے دانت والی۔''

ایک بار پھر پانی پت کا رن پڑنے ہی والا تھا کہ ممی نے آصف کو ڈھکیلا۔ آصف باہر بھاگا۔ پاپا اور گڑیا کے قہقہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ ایک بار پھر سب کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

آصف نے گڑیا کو ترکی بہ ترکی جواب دینے اور اس پر وار کرنے کی دھن میں طاق پر نظر ڈالے بغیر ہی ہاتھ بڑھا کر ٹوتھ پیسٹ لپک کر لے لیا۔ لیکن جب زبان پر پیسٹ کی لذت بدلی بدلی محسوس ہوئی تو وہ دوبارہ کمرے میں واپس آیا۔ طاق پر نظر ڈالی۔ دماغ میں ایک بجلی سی

کوندی۔ ایک بار پھر ایسا بھنایا کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ دیکھتا بھی کیا اور کس کو؟ آنکھ ملاتا بھی تو کس سے؟ کیوں کہ گڑیا کو معلوم ہو جاتا کہ اس نے فیس کریم دانتوں پر مل لی ہے تو ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں اس کے نشانے پر رہتا۔ گڑیا ایسا مذاق اُڑاتی کہ اسے چھٹی کا دودھ ہی یاد آ جاتا۔ ابھی تو جان بچانی چاہیے۔ آصف بھاگا۔ باتھ روم میں پہنچا۔ صابن مل مل کر رگڑتا رہا مگر جب دوبارہ شاور کھولا تو چند ہی قطرے ٹپکے۔ آصف چلایا۔ ممی کو پکارا، تب کہیں تقریباً پندرہ منٹ بعد شاور جاگا۔ بہت دیر بعد جب وہ باہر آیا تو ایک بار پھر سب کی ہنسی نے اس کا استقبال کیا۔ بھلائی اسی میں تھی کہ وہ بھی بے شرمی سے ہنس دے۔ اور وہ ہنس پڑا۔ □

Dr Iqbal Barki
155 Maha Da, Noor Bagh Malegaon-423203 Mah.

نظم

صبا منیر

وہ بچپن کے دن بھی تھے کتنے سہانے

وہ بچپن کے دن بھی تھے کتنے سہانے
کہ کام آہی جاتے تھے سارے بہانے
نہ اسکول جانے کی رہتی تھی چنتا
نہ ٹیچر کی ڈانٹیں ، نہ ڈرتھا سزا کا
کبھی سائیکل پر سواری تھے کرتے
کبھی اٹھ کے گرتے کبھی گر کے اٹھتے
کبھی بارشوں میں مچاتے تھے ہلّا
کبھی کرتے بولنگ، کبھی صرف بلا
کھلونے جو ملتے خوشی سے اچھلتے
جو دیکھی مٹھائی تو اس پر جھپٹتے
کبھی روکے ضد اپنی پوری کراتے
کبھی ہنس کے بھولی سی صورت بناتے
کبھی تھام کر ہاتھ ابو کا اپنے
قدم در قدم ساتھ چلتے تھے سپنے

جب امّی محبت سے بانہوں میں بھرتیں
تو جنت کی گھر میں فضائیں مہکتیں
وہ ہر شب محبت کا آنچل اوڑھا کر
سلاتی تھیں ہم سب کو لوری سنا کر
نہ لڑتے کسی سے نہ دل میں تھا کینہ
یوں ہی کاش چلتا ہمارا سفینہ
وہ معصوم سا بچہ دل میں مرے بھی
یہ کہتا ہے مجھ سے کہ لے چل مجھے بھی
وہیں اپنی 'بچوں کی دنیا' کے گھر میں
بسادے مجھے پھر خوشی کے نگر میں
بہت یاد آئے وہ پیارے زمانے
تو یہ نظم لکھوادی جیسے خدا نے
وہ بچپن کے دن بھی تھے کتنے سہانے
وہ بچپن کے دن بھی تھے کتنے سہانے

Miss Saba Munir Maulana Azad College Rauza Bagh Aurangabad-431001 (Mah)

آؤ دیکھیں

محمد خلیل

انڈین ریلوے میوزیم کی سیر

ہمارے زمانے میں بچے ریل کا کھیل خوب مزے سے کھیلتے تھے۔ایک دوسرے کی کمر پکڑ کر منہ سے چھک چھک کی اور سیٹی کی آواز نکالتے بچوں کو ریل کا کھیل کھیلتے اکثر دیکھا جاتا تھا۔لیکن اب نہ ریل کی وہ چھک چھک ہے نہ وہ سیٹی نہ وہ کھیل۔ بھک بھک دھواں اور چھک چھک بھاپ چھوڑتے ہوئے وہ ریل انجن بھی اب صرف فلموں میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔لیکن راجدھانی دہلی میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں آپ نہ صرف ان پرانے انجنوں اور ریل گاڑیوں کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ ان میں سفر بھی کر سکتے ہیں۔یہ ہے ہمارا ریل میوزیم جس کی آج ہم آپ کو سیر کرائیں گے۔

لیکن پہلے ہندوستانی ریلوے کی تاریخ پر نظر ڈالنا ٹھیک رہے گا۔ہندوستان میں ریل کے ذریعے سفر کرنے کے بارے میں کب سوچا گیا اس کا تو صحیح پتہ نہیں لیکن سرکاری ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے 1831 میں پریسیڈینسی آف مدراس میں ریل چلانے کے بارے میں بات چیت ہوئی اور 1850 میں ہندوستان میں پہلی ریلوے لائن بچھانے کا کام شروع ہوا۔پھر 1853 میں یعنی تین سال

انڈین ریلوے کا ایک بہت پرانا انجن

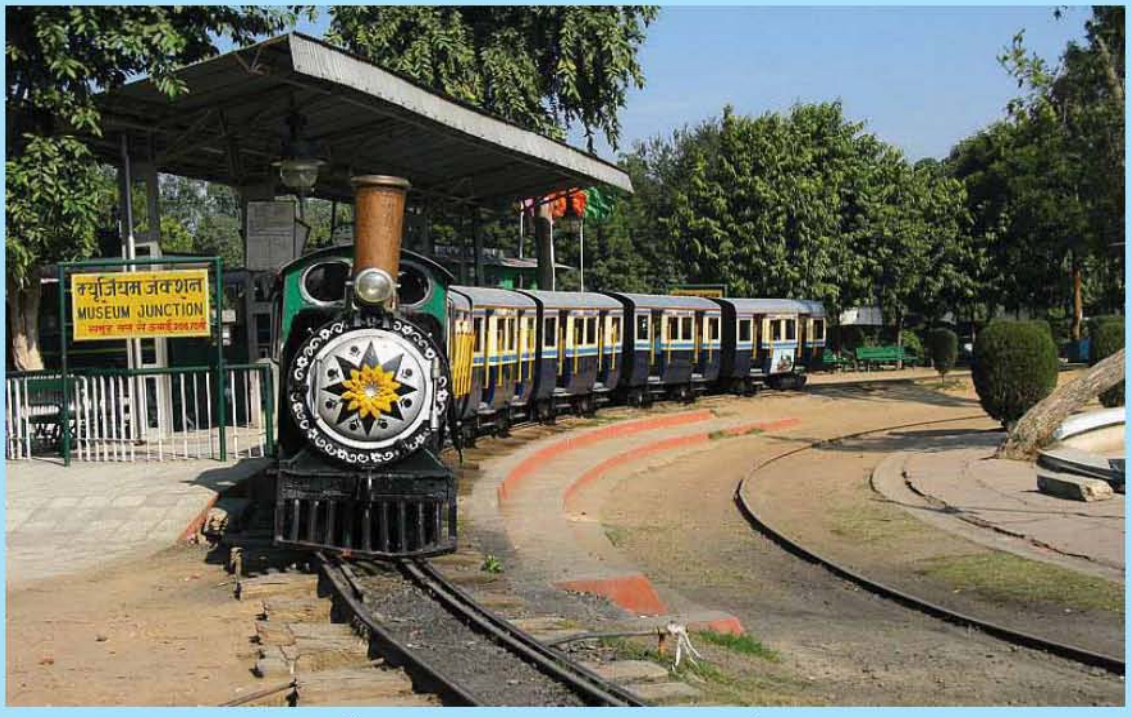

ریلوے میوزیم کی کھلونا ٹرین جس پر سوار ہو کر آپ پورے میوزیم میں گھوم سکتے ہیں

بعد ہی بڑے جوش اور دھوم دھام سے بمبئی کے پوری بندر ریلوے اسٹیشن سے شام کے وقت تقریباً ساڑھے تین بجے چار سو خاص مسافروں کے ساتھ بیس ڈبوں والی ہندوستان کی پہلی ریل بمبئی سے چل کر چار پینتالیس یعنی پونے پانچ بجے تھانے کے مقام پر پہنچی۔ اس تاریخی واقعے کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جب ریل گاڑی کا سفر شروع ہوا تو اسے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔

ایک اور پرانا انجن جو ابھی تک چلتا ہے

اس ریلوے لائن کو صرف ہندوستان کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کی پہلی ریلوے لائن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کے بعد 1854 تک یہ ریل لائن بمبئی میں کلیان کے مقام تک پہنچائی گئی اور پھر 1856 تک یہی ریل لائن بڑھا کر کھپولی تک پہنچی۔ جب کہ ہندوستان کی پہلی مسافر ریل گاڑی 15 اگست 1854 کو کلکتہ کے قریب ہوڑہ کے مقام سے چل کر تقریباً چوبیس میل کی دوری پر ہگلی پہنچی۔ اس طرح ہمارے ملک میں ریل کے ذریعے سفر کا پھیلاؤ شروع ہوا۔

دہلی میں جو ریل کا میوزیم ہے اس کا نام 'نیشنل ریل میوزیم' ہے۔ یہ ایک بڑا ہی دل چسپ اور تعجب خیز میوزیم ہے جہاں ہندوستانی ریلوں کی چھوٹی سے چھوٹی کڑی کو بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس طرح اسے ہندوستان کا پہلا 'ریل میوزیم' ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

یہ لمبا چوڑا انجن جب ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوتا تھا تو لگتا تھا بھونچال آ گیا ہے

اس میوزیم کا افتتاح 1977 میں اس وقت کے وزیر ریلوے جناب کملاپتی ترپاٹھی نے کیا۔ آج اس کو قائم ہوئے تقریباً 37 سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں یہ ایک بڑے میوزیم کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ آج اس میں رکھے ہوئے ماڈل اور خوبصورت تصویریں اور دوسرے رکھے ہوئے سامان ہندوستان میں پھیلی ہوئی ریلوں کے سفر کی ہی نہیں بلکہ ہوائی سفر اور پانی کے سفر کی کہانیاں بھی بیان کرتے ہیں اور ٹرانسپورٹ کی بدلتی ہوئی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ ریل میوزیم دس ایکٹر سے زیادہ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ میوزیم کے ایک حصے میں ایک خوبصورت آٹھ زاویوں والی عمارت بھی موجود ہے۔ اس عمارت کے اندر کئی ماڈل چھ گلیوں والے برامدوں میں رکھے گئے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں گے جیسے کسی ریلوے یارڈ میں سیر کر رہے تھے۔

اس ہاتھی کی کھوپڑی جس کی ٹکر سے ڈیڑھ سو سال پہلے ایک ٹرین الٹ گئی تھی

دروازے کے قریب رکھے ماڈل بچوں کو ہی نہیں بڑوں کو بھی اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ چھوٹے بڑے طرح طرح کے انجن،

پہاڑی اونچائیوں تک پہنچانے والی نیل گری ہل ٹرین کا ڈبہ اور نیچے، بائیں، وہ خاص طرح کی ریل لائن جس پر یہ ٹرین چلتی تھی

ان کے ڈبے، راجوں رجواڑوں کی ریل گاڑیوں کے پرانے خاندانی نشانات، تحریریں، تاریخی دستاویز یہاں موجود ہیں۔ ایک خاص گلی میں صرف آزادی کے بعد کے زمانہ میں ریلوں کی ترقی اور جدید طرح کی ریل گاڑیوں کو تصویروں کے ذریعہ اچھی طرح دکھایا گیا ہے۔ تصویروں کے ذریعے یہاں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ریلوے کے میدان میں ہم کس طرح خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکے ہیں۔

میوزیم میں ایسی بہت سی چیزیں آپ کو دیکھنے کو ملیں گی جو مشکل سے کہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی چیزیں بھی رکھی گئی ہیں جو اس میوزیم کے باہر دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ ان میں خاص طور پر قابل، ذکر ہے گیلری نمبر دو میں آراستہ کیا ہوا ایک دو منزلہ کوچ (ریل کا ڈبہ) جس کا استعمال مشرقی ہندوستانی ریلوے یا ناردرن انڈین ریلوے کے ذریعے 1864 سے 1903 تک کیا گیا۔ اسی گیلری میں ہاتھی کی کھوپڑی کا ایک ٹکڑا بھی رکھا گیا ہے۔ یہ اس ہاتھی کی کھوپڑی کا ٹکڑا ہے جس نے 28 ستمبر 1864 کی رات کلکتہ سے دو سو میل کی دوری پر سرنڈا جنگل میں ریل کو ٹکر ماردی تھی اور انجن کے ساتھ لگے ہوئے سات ڈبے پٹری سے اتر گئے تھے۔ اس ہاتھی کا ایک دانت لندن کے بورڈ آفس میں محفوظ ہے جبکہ دوسرا دانت ریل کے ڈرائیور کو دے دیا گیا تھا۔

میوزیم کی تیسری گیلری میں آپ ایک ماڈل دیکھیں گے۔ یہ کلار

بجلی سے چلنے والا ایک پرانا ہندوستانی ریلوے انجن

اسٹیشن نیل گری کی پہاڑی ریلوے یارڈ کا ہے۔ اسی پہاڑی ریلوے میں کلار سے کنور تک 'ریک' ریلوے تکنیک سے چلنے والی گاڑی آتی جاتی تھی۔ اس تکنیک کی مدد سے ریل پہاڑی ڈھلانوں کے علاقوں پر چلنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس طریقہ کار کو سوئزر لینڈ کے رہنے والے ایم ایس ریگی نیچ نے پیٹنٹ کرایا تھا۔

میوزیم کی چھٹی گیلری میں پہنچنے پر ہندوستانی ریلوے کی جدید ترقی کی جھلک ملتی ہے۔ ان کو دیکھنے پر ہم بجلی کا انجن، ڈیزل انجن، مسافروں کے ڈبے اور مختلف قسموں کے نئے اوزار اور آلات دیکھتے ہیں۔

سبھی گیلریوں کی سیر کرنے کے بعد آپ جیسے ہی میوزیم کی عمارت سے باہر نکلیں گے تو کھلے ماحول میں جہاں مختلف قسموں کے انجنوں اور ریل کے ڈبے کھڑے پائیں گے۔ اس میوزیم یارڈ میں اصلی ریل انجن، ریل کے ڈبے، مختلف چوڑائی والی ریل پٹریوں پر کھڑے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ حصہ کوئی ریلوے اسٹیشن ہے۔ ریل کے ڈبے ان پٹریوں پر چلائے جاسکتے ہیں۔ یہاں جو کچھ آپ کو دیکھائی دے گا سب ہی چلنے کی حالت میں ہیں۔ یہ پٹریاں ملٹی گیج پوائنٹس پر جڑی ہوئی ہیں۔ ان کو کھلی جگہ میں اس طرح رکھا گیا ہے کہ آنے والے ان کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اور ہر زاویے سے آپ ان کی تصویر بھی لے سکتے ہیں۔ اس میوزیم میں کچھ نہایت قیمتی ماڈل موجود ہیں جو گزرے برسوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ انہیں ضرور دیکھیے۔ جیسے فیری کوئن جو دنیا سب سے پرانا قابل استعمال ریلوے انجن ہے۔ یہ اب بھی ایسی حالت میں ہے کہ اسے دنیا میں کہیں بھی چلایا جاسکتا ہے۔ اسے 1855 میں ہندوستانی ریلوے نے امریکہ سے خریدا تھا۔ اس کا استعمال اس وقت ہوڑہ اور رانی گنج کے بیچ چھوٹی ریلوں کو کھینچنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ دونوں اسٹیشنوں کے بیچ کی دوری تقریباً ایک سو بیس میل تھی۔ اس وقت باہر کے ملکوں سے ریل کے پرزے منگوانے کے بعد ریلوے کی جمال پور ورکشاپ کو جوڑنے کے بعد انجنوں کی تیاری کی جاتی تھی۔ لیکن اس کی پوری تیاری ہندوستان کی اجمیر ورکشاپ میں ہوئی تھی۔ اس کا استعمال پہلے

1876 میں پرنس آف ویلز کے لیے آگرہ ورکشاپ میں بنایا گیا سیلون

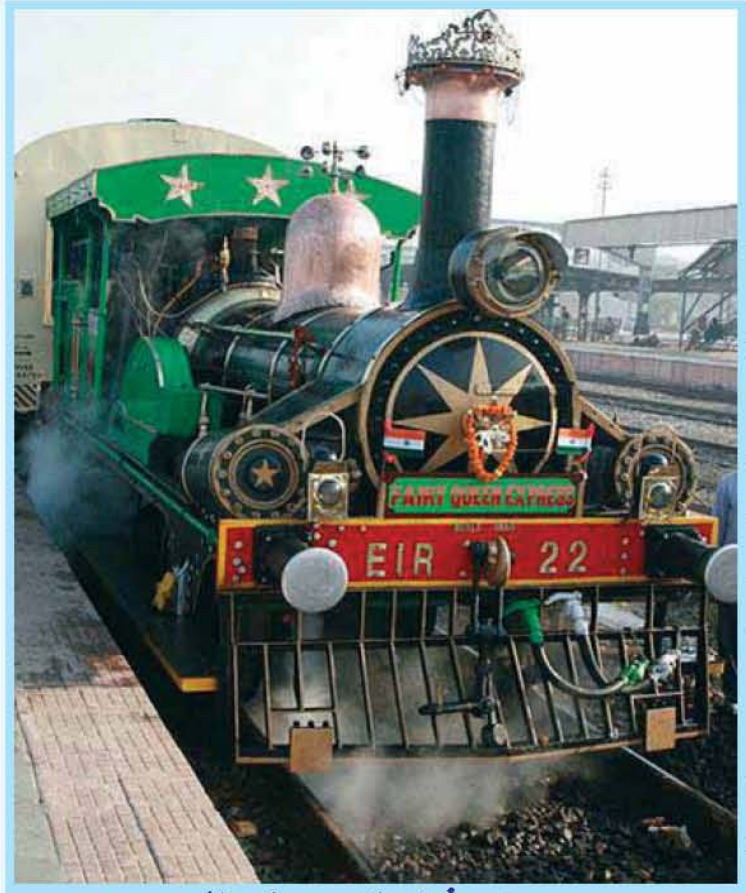

دنیا کا سب سے پرانا ریلوے انجن فیئری کوین جو آج بھی چلنے کی حالت میں ہے

راجپوتانہ مالوا ریلوے کے ذریعے اور بعد میں دوسرے ریلوے ورکشاپ کے ذریعے مکسڈ ٹریفک کے لیے کیا گیا تھا۔ پرنس آف ویلز سیلون کسی محل کا نہیں بلکہ کوچ کا نام ہے۔ یہ لوہے کے فریم پر لکڑی سے بنا ہوا چار پہیوں والا کوچ ہے۔ اس کے اندر آج بھی اس وقت کا فرنیچر اور سامان اسی طرح رکھا ہوا ہے۔ اپنے نام کی طرح یہ کوچ خاص طور پر ویلز کے شہزادے (بعد میں کنگ ایڈورڈ ہفتم) کے لیے اس وقت بنایا گیا تھا جب وہ 1876 دربار کے وقت ہندوستان گھومنے آئے تھے۔ شہزادے کی حفاظت کے لیے کوچ کے باہر ہتھیار بند پہرے داروں کے کھڑے ہونے کا بھی انتظام تھا۔ اس کو راجپوتانہ مالوا ریلوے ورکشاپ آگرہ میں تیار کیا گیا تھا۔

میسور مہاراجہ کا سیلون ایک خاص ریل گاڑی کے ان تین ڈبوں میں سے ایک ہے جن کا استعمال میسور کے مہاراجہ اور ان کا خاندان کیا کرتا تھا۔ دوسرے دو ڈبوں میں سے ایک ڈبہ مہارانی کا ہے اور ریل کے دوسرے ڈبے میں باورچی خانہ اور کھانے کا ڈبہ ساتھ ہی ہے۔ یہ دونوں ڈبے اب میسور میں قائم ریل میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔

میسور کی مہارانی کا ریلوے سیلون

راجہ کے لیے بنا ہوا ڈبہ اسٹیل فریم پر لکڑی سے تیار کیا گیا ہے جس میں آٹھ پہیے لگے ہوئے ہیں۔ اس کوچ کی خاصیت یہ ہے کہ میسور سے مدراس کے سفر کے دوران شاہی خاندان کے سفر میں بغیر رکاوٹ کے ڈبوں کو چھوٹی اور بڑی پٹریوں پر چلایا جاسکتا تھا۔ یہ ڈبہ اب بھی اپنے خاص ساز و سامان کے ساتھ آراستہ ہے۔ اس کی تیاری میسور حکومت ریلوے ورکشاپ بنگلور نے کی تھی۔ لیکن اس کا فریم 1899 میں امریکہ کی ایک کمپنی سے منگوایا گیا تھا۔

میوزیم میں ایک خاص دل چسپی کی چیز ہے مونو ریل، جسے 1976 میں جنوب (دکن) ریلوے کی امرتسر ورکشاپ میں اصل فریم پر ہی دوبارہ بنایا گیا ہے۔ اصل میں یہ ڈبہ کرنل باؤلس کا ہے

دہلی میں میٹرو ریل چلا کر ہم نے اکیسویں صدی میں انڈین ریلوے کو بالکل نئی شکل دینے کے سفر کا آغاز کیا

جنھوں نے 1907 میں تقریباً پچاس میل لمبی، سرہند سے عالم پور اور پٹیالہ سے بھوانی گڑھ تک کی ریل پٹری بنائی تھی۔ اس ڈبے کو وہ شخصیاتی معائنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بعد میں غیر معمولی مونو ریل پٹیالہ کے مہاراجہ کے لیے تیار کی گئی تھی جسے شاہی اصطبل کے خچر کھینچتے تھے۔ یہ مونو ریل ابھی بھی مسافروں کو بیٹھا کر چلائی جاتی ہے لیکن اس میں گھومنے کا شوق رکھنے والوں کو سات دن پہلے اطلاع دینی ہوتی ہے۔ اور آٹھ لوگ اس ڈبے میں بیٹھ سکتے ہیں۔

میوزیم کی گلیوں اور کھلے احاطے میں رکھے ہوئے ماڈل کو دیکھنے پر ہندوستانی ریل کی ترقی کی کہانی جو شروع سے آج تک، سامنے آجاتی ہے۔ ریل کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے طالب علموں، تعلیمی اداروں کے لیے یہ ایک ایسا میوزیم ہے جہاں ریلوے کی ترقی کے بارے میں پوری جانکاری مل جاتی ہے۔ اس میوزیم میں ایک لائبریری بھی ہے جس کے ایک حصے میں پرانی تحریریں محفوظ ہیں۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں جو چیزیں رکھی ہوئی ہیں وہ اسی شکل اور رنگ میں ہیں جیسی وہ آئی تھیں۔ آج بھی یہاں رکھے انجن اور ڈبوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے یہ نئے ہوں۔

میوزیم دیکھنے کے لیے لوگوں کو کافی چلنا پڑتا ہے۔ جس سے وہ تھک جاتے ہیں۔ اس تھکان کو دور کرنے کے لیے میوزیم میں 'جوئے ٹرین' Joy Train ہے۔ یہ ریل جنکشن سے چھوٹتی ہے اور پیڑوں اور جنگلوں سے گزر کر ایک چکر میں پھر میوزیم جنکشن پر آکر رک جاتی ہے۔ یہاں سامنے ایک ریستوران بھی ہے جہاں آپ ریلوے اسٹیشن کی طرح چائے پی سکتے ہیں۔ میوزیم میں داخلہ ٹکٹ سے ہوتا ہے اور یہ صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ پیر کے دن میوزیم بند رہتا ہے۔ نئی دہلی کی طرح ایک دوسرا ریل میوزیم کرناٹک میں میسور ریلوے اسٹیشن کے سامنے بنایا گیا ہے۔ □

Mr Mohd Khalil H - 51 Dr Iqbal Lane,
Batla House, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

تعلیم

نورآفاق

بچو، تعلیم نام ہے میرا
خوب سیرت نظام ہے میرا

آج میری بڑی ضرورت ہے
مجھ سے ہر آدمی کی عزت ہے

میری ہر بات ہے قرینے کی
میں بتاتی ہوں راہ جینے کی

میرے دم سے ہیں صنعتیں ساری
ہر طرف فیض ہے مرا جاری

بند رہتی ہوں میں کتابوں میں
تم مجھے پاؤ گے نصابوں میں

مجھ سے جو لوگ فیض پاتے ہیں
وہ بڑی دولتیں کماتے ہیں

مجھ سے گھبراؤ اب نہ شرماؤ
سیدھے اسکول تم چلے آؤ

نیک باتیں تمہیں سکھاؤں گی
اور انساں تمہیں بناؤں گی

پھر بڑے آدمی بنو گے تم
خوب آرام سے رہو گے تم

Mr Noor Asfaq 2/153, O.P. Street, Jehabad Post, Vaniyambadi-635754 TN

مترجم: انیس الدین ملک/نظر ثانی: نصرت ظہیر

سائنس کی الف لیلہ

شیشے کی کہانی

شیشہ یا کانچ اگرچہ قدرتی طور سے پایا نہیں جاتا لیکن انسان اس کو تقریباً تین چار ہزار سال سے استعمال کر رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بہت پہلے اسے کنعان میں، جس کا ذکر انجیل میں ہے، بنایا جاتا تھا جس کا تجارتی مرکز سڈون شہر تھا۔

کنعان، جس کو رومن تاریخ داں پلینی دی ایلڈر Pliny The Elder نے فنیسیا Phoenicia کہا ہے، شام Syria میں بحر روم کے کنارے ایک خوش حال ضلع تھا۔ اس علاقہ کی سیرابی کا ذریعہ دریا بلس تھا، اور اس دریا کے شروع ہونے کی جگہ کوہ کارمیل کے دلدلی علاقہ میں ہے، جہاں سے یہ تقریباً 5 میل تک بہتا ہوا سمندر میں مل جاتا ہے۔ دریا کے دہانے کے تقریباً آدھے میل تک اس کے ذریعے لائی ہوئی مٹی اور ریت جمع ہو جاتی ہے۔ سمندر سے آئے ہوئے جوار بھاٹے کا پانی ریت کو دھو دیتا ہے جس سے ریت میں ملی بہت سی چیزیں سمندر کے کنارے کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ پیچھے چاندی جیسی ریت رہ جاتی ہے جو سورج کی روشنی میں چمکتی ہے۔ فنیسین کے لیے یہ سنگ ریتیلا علاقہ ہی شیشے یا کانچ کی اچانک دریافت کا سبب بنا۔

اتفاق سے دریافت ہو جانا شیشے کا

فنیسیا کے لوگ بڑے محنتی تھے۔ یہ لوگ بحری سفر کے ذریعے اس زمانے میں دریافت شدہ ممالک میں تجارت کی غرض سے جاتے اور خام یعنی کچے مال کے بدلے اس سے تیار شدہ سامان دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ لوگ برطانیہ جاتے اور وہاں کپڑے کے

سائنس کی کہانیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن میں ایک خیالی سائنسی دنیا ہوتی ہے۔ انہیں سائنس فکشن کہا جاتا ہے۔ دوسری سائنسی کہانیاں وہ ہیں جن میں سائنس کے کسی معاملے کی، مثلاً کسی ایجاد یا دریافت وغیرہ کا قصہ بیان کیا گیا ہو۔ یہ قصے بھی کسی فرضی کہانی سے کم دل چسپ نہیں ہوتے۔ اس وقت جو مضمون آپ پڑھنے والے ہیں اس کے ساتھ ہم سائنس کی ایسی ہی کہانیوں کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ سائنس اب تک بہت ترقی کر چکی ہے لیکن ان پرانی کہانیوں کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ انہیں پڑھنے سے آپ کو بہت کچھ سمجھنے میں مدد ملے گی۔ قومی اردو کونسل نے پہلی بار 1888 میں انگریزی سے ترجمہ کرانے کے بعد ایک کتاب 'سائنس کی کہانیاں' کے نام سے چھاپی تھی۔ اب تک یہ چار مرتبہ چھپ چکی ہے اور ہم نے یہ کہانیاں اسی کتاب سے لی ہیں اور ان پر نظر ثانی بھی کی ہے! (اعزازی مدیر)

بدلے کو رنیعال کی کانوں سے نکلے رانگے کو خرید لیتے۔ یہ لوگ اکثر قریبی ملک مصر جایا کرتے تھے اور وہاں سے سوڈیم کاربونیٹ یعنی خام سوڈا لاتے جس میں تھوڑی مقدار میں سوڈیم بائی کاربونیٹ کھانے کا نمک اور دوسری ملاوٹیں ہوتی تھیں۔ خام سوڈا مصر میں جھیلوں کے کنارے کثرت سے پایا جاتا تھا اور اس کو کپڑے اور دوسری چیزوں کے دھونے میں استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں صابن کی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ مصری اس کو مرے ہوئے انسانوں کے جسم کو

مصری تہذیب کی ایک تصویری جھلک: کہتے ہیں فنیشیا سے بھی پہلے مصر میں کانچ کا استعمال شروع ہو جانے کے ثبوت ملے ہیں

ممی کے طور پر محفوظ کرنے میں بھی استعمال کرتے تھے۔

پلینی نے اتفاقی دریافت کی کہانی بیان کی ہے۔ اس کے مطابق بیلس کے ساحل کے قریب تنگ علاقہ میں جہاز راں خام سوڈے سے لدے جہاز اترے اور اپنا کھانا تیار کرنے لگے۔ اس ریتیلے ساحل پر جب انھیں اپنے برتن آگے پر رکھنے کے لیے کوئی پتھر نہ ملا تو یہ اپنے جہاز سے سوڈے کے بڑے بڑے ٹکڑے لے آئے۔ پھر انھوں نے اپنے برتن کے نیچے آگ جلائی، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک نامعلوم شفاف رقیق مادّے Liquid کو بہتے ہوئے دیکھ کر یہ لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ یہ رقیق سوڈے اور ریت پر گرمی کے عمل سے بنا تھا اور اصلیت میں یہ رقیق کانچ تھا، جس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔

سوڈے اور ریت کو گرم کر کے کانچ بنانے کے اس اتفاقیہ طور سے دریافت ہونے والے طریقے کو ہنرمند فنیشیائیوں نے ترقی دی اور جلد ہی کانچ کی مختلف چیزیں بنانے لگے۔ شروع میں شاید انھوں نے شیشے کے رنگین دانے بنائے اور اسے دوسرے ملکوں کی کم ترقی یافتہ قوموں کے ہاتھوں کا آمد سامان کے بدلے بیچا۔

کانچ بنانے کے اس طریقے کی اچانک دریافت کے اس قصے کی موافقت یا مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن کانچ بنانے میں سوڈیم کاربونیٹ، ریت اور گرمی کے استعمال کا ذکر بلاشبہ صحیح ہے۔

چوتھی صدی عیسوی میں روم میں بنایا گیا شیشے کا جام

بیلس کے قریب تنگ علاقہ میں پائے جانے والا ریت شیشہ سازی کے لیے نہایت موزوں ہے اور اسے اس مقصد کے لیے سینکڑوں برس سے استعمال کیا جا تا رہا ہے۔ لیکن بہت سے مصنفین کو اس بارے میں شبہ ہے کہ سمندر کے کنارے لکڑی کو جلا کر حاصل کی ہوئی گرمی سے درجہ حرارت اتنا کیسے پہنچا ہوگا جس نے ریت اور سوڈے کو پگھلا کر رقیق کانچ بنا دیا ہے۔

رقیق کانچ بنانے کے لیے ضروری درجۂ حرارت ریت اور سوڈے کے تناسب پر منحصر ہے۔ حال ہی کے ایک تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ لکڑی کو کھلی ہوا میں دو گھنٹے تک جلانے سے اتنی حرارت مل سکتی ہے جو کسی بھی ایسی آمیزش یا مکسچر کو پگھلا سکتی ہے جس سے بیشتر کانچ بن سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ فنیسیائیوں کو آگ جلانے سے اتنی ہی حرارت ملی تھی جتنی اس قصے کے مطابق اتفاق سے ہونے والے تجربے میں کام آئی ہوگی۔

خیر یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ فنیسیا کے ملاحوں کو کم از کم اتنی گرمی ضرور دستیاب ہوئی جس نے ریت اور سوڈے کو کیمیائی ردعمل Chemical Reaction پر مجبور کر دیا اور اس آمیزے Mixture کو شیشے میں بدل دیا۔ اس سے کسی بھی ذہین آدمی کو اس بات کا اشارہ مل سکا ہوگا کہ سوڈے اور ریت کو ایک خاص قسم کی بھٹی میں گرم کرنے پر ایک نئی چمکیلی اور دلکش شے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اب جو کہانی آپ پڑھیں گے اس سے بہت شدید آگ سے کانچ بنانے کے طریقے کی دریافت کا پتہ چلتا ہے۔

کچھ لوگوں کے بیان کے مطابق اسرائیلی بچوں نے ایک جنگل میں آگ لگا دی۔ آگ اتنی تیز تھی کہ اس کی تپش سے نائٹر اور سوڈا پگھل کر مل گئے اور لاوے کی طرح پہاڑیوں کی ڈھلان سے بہنے لگے۔ اس کے بعد سے لوگ مصنوعی طریقے سے کانچ بنانے لگے۔ جو پہلے اتفاقی طور سے بن گیا تھا۔ یہاں پر نائٹر سے مراد کسی کھاری شیشے سے ہے جو سوڈا یا اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہو سکتی ہے۔

فنیسیائیوں یا اسرائیلیوں نے یا دونوں نے اتفاقی طور سے کانچ بنانے کا طریقہ دریافت کیا اس کے بارے میں زیادہ شہادت نہیں ملتی ہے۔ تاہم یہ بات پوری طرح سچ ہے کہ قدیم مصریوں کو ان دونوں قوموں سے بہت پہلے کانچ بنانے کا طریقہ معلوم تھا۔ کیونکہ قدیم مصریوں کے پاس شیشے کے ایسے سامان ملے ہیں جو فنیسیائیوں کے ہاتھوں شیشے بنانے کی دریافت سے کئی سو سال پرانی ہیں۔

شروع میں شیشہ زیادہ تر جام یا عطر کی شیشیاں بنانے میں استعمال ہوا

حضرت عیسیٰ کے زمانے کے رومن شہنشاہ تبرس Tiberius کا مجسمہ

کچھ دانشوروں کی رائے میں جنھوں نے پرانی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، شیشہ بنانے کا فن، چینی برتن بنانے کے فن کے ساتھ ساتھ بتدریج وجود میں آیا کیونکہ مصری لوگ ان برتنوں پر جس شے کا ملمع کیا کرتے تھے، یعنی پرت چڑھاتے تھے وہ کیمیاوی طور سے شیشے کی مانند تھی۔ ان دانشوروں کا یہ بھی یقین ہے کہ یہ طریقہ مصر میں ایجاد ہوا اور وہاں سے بعد میں فینیسیا اور دوسرے ملکوں میں آیا۔

کانچ کو کب اور کہاں سب سے پہلے تیار کیا گیا یہ ایک بحث طلب موضوع ہے لیکن بلاشبہ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں روم کے حکمراں شہنشاہ تبرس کے دور میں مصری کانچ بنانے کے فن میں لاثانی تھے۔ اس سے صدیوں پہلے بھی مصری بڑے پیمانے پر کانچ تیار کرتے تھے جو دوسرے ملکوں میں فروخت کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا اور وہ اسے کافی اونچے داموں پر بیچا کرتے تھے۔ تبرس نے مصری کاریگروں کو روم میں شیشے کے کارخانے قائم کرنے اور رومن کاریگروں کو اس کے بنانے کا فن سکھانے کے لیے آمادہ کیا۔ یہ مہم اتنی کامیاب رہی کہ شہنشاہ نیرو (65 عیسوی) کے زمانے میں رومن شیشے کے برتن بنانے اور پچی کاری میں مصریوں کے برابر آ گئے تھے۔ مثلاً نیرو نے کانچ کا ایک شراب کا جام بنوایا تھا جس کی قیمت آج کے حساب سے تقریباً پچاس ہزار پونڈ ایک کروڑ دس لاکھ روپے تھی۔

رومن مورخ پلینی دی ایڈورڈ

ایک روایت کے مطابق تبرس کے دورِ حکومت میں ایک شخص نے ایک خاص قسم کا کانچ

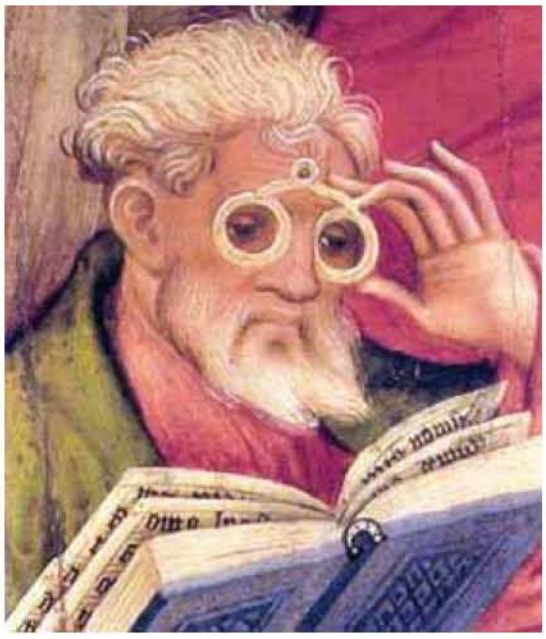

شیشے کی ایجاد یا دریافت کا انسان کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی مدد سے لینس بنائے جا سکے جن سے چیزیں چھوٹی یا بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اس سے کمزور بینائی والوں کے لیے بھی صاف دیکھنا ممکن ہو گیا!

بنانے کا طریقہ دریافت کیا جو ضرب لگانے پر معمولی کانچ کی مانند کرچوں میں نہیں ٹوٹتا تھا بلکہ اس میں صرف نشان پڑ جاتے تھے۔ اس نے اس کانچ کا ایک خوبصورت پیالہ بنایا۔ وہ سوچتا تھا کہ تبرس کو کانچ بنانے کے فن میں کافی دلچسپی ہے اس لیے وہ بادشاہ کے حضور میں اسے تحفتاً پیش کر کے اس کی مہربانیوں کا فائدہ اٹھا سکے گا۔ لیکن جیسا کہ بہت سی پرانی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بھی کئی کہانیاں ہیں۔ ایک پرانے مصنف کے مطابق وہ آدمی ایک سابق معمار تھا اور اسے تبرس نے ملک بدر کر دیا تھا۔ اس معمار نے اپنے دورِ جلاوطنی میں دریافت کیا کہ کبھی نہ ٹوٹنے والا یا لچک دار کانچ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ طریقہ سمجھ میں آنے کے بعد اس نے کانچ کا ایک شراب پینے کا برتن بنایا۔ اب اسے یہ امید تھی کہ ایسا عمدہ اور بے نظیر تحفہ پا کر تبرس نہ صرف اسے معاف کر دے گا بلکہ جلاوطنی کا حکم واپس لے کر اسے انعام و اکرام سے بھی نوازے گا۔

مورخ پلینی نے بھی اس حیرت انگیز دریافت کی چند تفصیلات دی تھیں۔ اس کے مطابق یہ روایت ہے کہ تبرس کے زمانے میں لچکدار کانچ بنانے کا طریقہ دریافت ہوا، لیکن اس قسم کے شیشے بنانے کے کارخانے مکمل طور سے تباہ کردیے گئے کیونکہ اس سے تانبہ، چاندی اور سونے کی وقعت گرنے کا خدشہ تھا۔ لیکن یہ کہانی ایک تصدیق شدہ واقعہ کی بجائے ایک لمبے عرصے تک محض افواہ بنی رہی۔

ایک دوسرے مصنف کے زیادہ تفصیلی بیان کے مطابق قصہ یوں ہے کہ ایک رومن کاریگر نے نہ ٹوٹنے والے شیشے کا پیالہ بنانے کا طریقہ دریافت کیا اور اس خیال سے کہ پیالہ بادشاہ کو تحفتاً پیش کرنے میں انعام واکرام ملے گا، اس نے ایک پیالہ بادشاہ کو پیش کیا، اس پیالے کی بہت تعریف کی گئی کیونکہ یہ بادشاہ کے سونے کے پیالوں سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ بادشاہ اس کا قریب سے معائنہ کرتا، کاریگر نے بادشاہ سے پیالہ چھین لیا اور زمین پر پٹخ دیا۔ بادشاہ اُس کی اِس حرکت سے چونکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کاریگر نے پیالہ اٹھالیا اور وہاں پر موجود لوگوں نے دیکھا کہ اس پر ایسے ہی نشان پڑ گئے ہیں جیسے کہ پیتل کے برتن پر پڑ جاتے ہیں۔ پھر کاریگر نے اپنی جیب سے ایک ہتھوڑی نکالی اور نشانوں پر ہلکی سی ضرب لگا کر پیالے کو درست کردیا۔

اپنی اس کارگزاری پر وہ آدمی بے انتہا خوش ہوا، اور پھر بادشاہ کے یہ پوچھنے پر کہ تمہارے سوا کانچ بنانے کے اس فن سے کوئی اور بھی واقف ہے؟ وہ یہ سمجھ بیٹھا جیسے اس نے جنت کی دولت پالی ہے اور کہا کہ کسی اور کو یہ طریقہ معلوم نہیں ہے۔ اس پر تبرس نے حکم دیا کہ اس شخص کا سر کاٹ لیا جائے کیونکہ اس فن کا راز کھل جانے کے بعد پر لوگ سونے کو خاک سے زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔

اس سلسلے میں زیادہ تر واقعات ان لوگوں کے تحریر کردہ ہیں جو تبرس کے زمانے میں موجود تھے اس لیے ان روایتوں کو پوری طرح رد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ نہ ٹوٹنے والا کانچ صدیوں تک بازاروں میں بکا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شہنشاہ کو پیش کیا جانے والا

پگھلے ہوئے شیشے میں سانس پھونک کر خوب صورت برتن اور آرٹ کے نمونے بنانے کا پرانا رواج آج بھی زندہ ہے اور یہ بڑا ہی نازک اور محنت کا کام ہے جس کے نمونے بہت مہنگے بکتے ہیں، نیچے کچھ نمونے دیکھیے

پیالہ ایک بلوری ریزن Resin کا بنا ہوا تھا جو کانچ کی مانند لگتا تھا لیکن بے لوچ نہیں تھا اور اس لیے چوٹ لگنے پر ٹوٹتا نہیں تھا۔

پچھلے دو ہزار سال میں کئی بار نہ ٹوٹنے والے شیشے کی دریافت کے دعوے کیے گئے۔ ان میں سے ایک دعویٰ خاص حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دریافت کرنے والے کو تبرس کے دورِ حکومت کی طرح

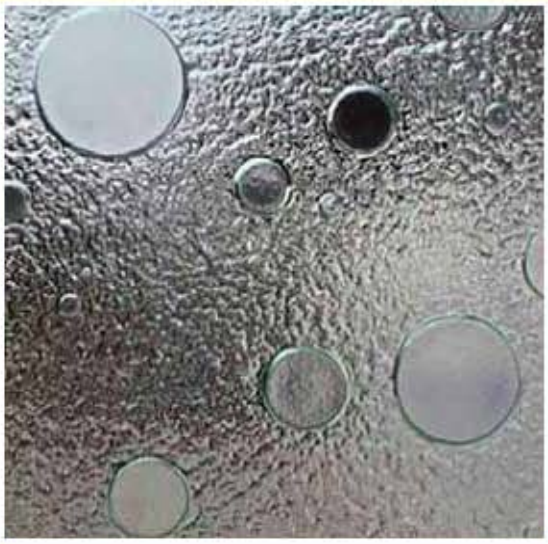

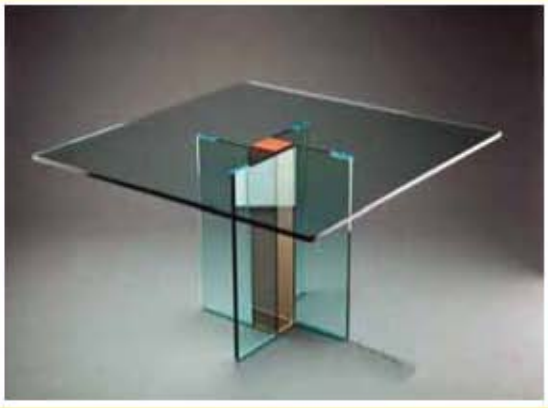

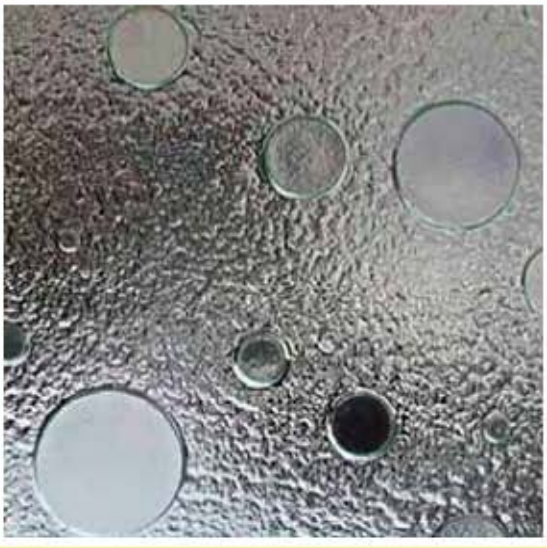

انعام نہیں مل سکا جس کی وہ امید کرتا تھا۔ یہ دریافت فرانس کے بادشاہ لوئی XIII کے عہد میں ہوئی۔ موجد نے اس نئے شیشے کا ایک پتلا بنایا اور کارڈنیل راشیل کو پیش کیا۔ کارڈنیل اس زمانے کا سب سے زیادہ پُر اثر سیاست داں تھا بلکہ درحقیقت وہی ملک کا اصل حکمراں بھی تھا۔ کارڈنیل نے بھی وہی کیا جو تھیمس نے کیا تھا اور موجد کو انعام واکرام کے بجائے عمر قید کی سزا ملی۔ کارڈنیل کو خدشہ تھا کہ اگر نہ ٹوٹنے والے شیشے کا استعمال عام ہوگیا تو فرانس کے شیشہ سازوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس لیے اس نئے کانچ کے بنانے کا طریقہ اگر کبھی معلوم بھی تھا تو وہ خفیہ رہا اور منظرِ عام پر نہیں آیا۔

اوپر بیان کی گئی مشہور دریافتوں میں سے کسی سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ لیکن اس صدی کے ابتدا میں ایک دن ایک فرانسیسی سائنسداں ایڈورڈ بینڈکٹس Edward Benedicts ایک چشم دید واقعہ سے دوچار ہوا جس میں ایک عورت کار کے شیشوں کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں سے شدید طور پر زخمی ہوئی۔ اس حادثے سے بینڈکٹس کے دماغ میں کئی سال پیشتر گزرے ہوئے سلولائڈ کے واقعے کی یاد آئی۔ اس زمانے میں سلولائڈ کثرت سے چاقو کے دستے، کنگھی، پیانوں کی چابی اور دوسری چیزیں بنانے کے کام میں استعمال ہوتا تھا اور یہ ہاتھی کے دانت اور ہڈیوں کا ایک سستا بدل تھا۔ آج کل اس کے بجائے پلاسٹک کے سامان استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ الکحل اور دوسرے آسانی سے گیس میں تبدیل ہونے والے سیال مادوں میں گھل جاتا ہے۔

1885 میں ایک تجربہ کے اختتام پر سلولائڈ کے محلول کو جو ایک بوتل میں تھا تجربہ گاہ کی ایک الماری کے اونچے تختے پر رکھ دیا گیا۔ یہ بوتل 1903 تک وہی رہی۔ ایک دن جب بینڈکٹس تجربہ گاہ کی صفائی کررہا تھا تو صفائی کے دوران اس بوتل کو اٹھاتے وقت وہ اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور فرش پر چکنا چور ہوگئی۔ بینڈکٹس کو یہ امید تھی کہ اب اسے چاروں طرف ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے اور ادھر ادھر پھیلی ہوئی کرچیں نظر آئیں گی۔ لیکن اس کے تعجب کی کوئی حد نہیں رہی جب اس نے دیکھا کہ گرچہ بوتل ٹوٹ گئی تھی لیکن اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے جوڑے

ہوئے تھے گویا کسی لیس دار شے سے جڑے ہوں۔

اس نے ٹوٹی ہوئی بوتل کو اٹھایا اور لیبل کو پڑھا جو پندرہ سال پہلے لگایا گیا تھا۔ اس سے اسے پتہ چلا کہ بوتل میں سلولائڈ کا ایک محلول تھا۔ بینڈکٹس نے اندازہ لگایا کہ 15 سال میں سلولائڈ جس رقیق Liquid میں ملایا گیا تھا وہ پوری طرح اڑ گیا تھا اور اسی سلولائڈ کی ایک تہہ بوتل کی اندرونی دیوار پر جم گئی تھی۔ اس نے تجسس کی غرض سے ٹوٹی ہوئی بوتل کو اپنے پاس رکھ لیا اور اس کے ساتھ ایک تحریر بھی لگادی کہ اس شکستہ بوتل میں پہلے کیا تھا اور کیا واقعہ پیش آیا۔

جب بینڈکٹس نے کار حادثہ دیکھا تو اسے شکستہ بوتل کی یاد آئی۔ اس کے دماغ میں ایک نیا خیال پیدا ہوا کہ وہ فوراً تجربہ گاہ میں واپس چلا آیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ساری رات وہاں رہا اور دن نکلنے تک اس کے دماغ میں حفاظتی شیشے کی چادریں بنانے کی ترکیب آگئی۔ اس کی ترکیب کے مطابق شیشے کی چادر کی ایک طرف سلولائڈ کے محلول کی تہہ بچھادی گئی اور جب محلول کا بیشتر حصہ ابخرات کی شکل میں اڑ گیا تو سلولائڈ ایک لعاب کی شکل میں بچ گیا۔ اس پر ایک دوسرے شیشے کی چادر رکھ کر دبادیا گیا اور اسے اس وقت تک چھوڑ دیا گیا جب تک اس میں سختی نہ آجائے۔ اس طرح شیشے کی دونوں چادریں ایک دوسرے سے مضبوطی سے جڑ گئیں۔ جب اسے بینڈکٹس نے توڑا تو چادر کے ٹکڑے ادھر ادھر نہیں پھیلے بلکہ سلولائڈ کی فلم میں ہی چپکے رہے۔ اس طرح اس نے ایک نئی دریافت کی جس سے حادثوں میں اڑتے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں سے زخمی ہونے کا خطرہ کم ہوگیا۔

اس حفاظتی شیشے میں تین تہیں تھیں، دو شیشے کی اور ایک سلولائڈ کی۔ بینڈکٹس نے اس نئی ایجاد کردہ چیز کو ٹرپلکس کا نام دیا اور 1909 میں اس کو پیٹنٹ کرالیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ٹوٹی ہوئی بوتل نے بینڈکٹس کو ٹرپلکس بنانے کا خیال دیا لیکن وہ پہلا شخص نہیں تھا جس نے تین تہوں کے حفاظتی شیشے کو پیٹنٹ کرایا۔ 1906 میں ایک انگریز جان سی وڈ کو بھی اسی قسم کا خیال آیا اور اس نے بینڈکٹس کے سلولائڈ کے بجائے کینڈا بام کا استعمال کیا۔ لیکن وڈ کی ایجاد تجارتی طور پر زیادہ کامیاب نہیں رہی جبکہ بینڈکٹس کا حفاظتی گلاس تجارتی طور پر بہت زیادہ مقبول ہوا۔

1909 سے اب تک حفاظتی شیشہ بنانے کے طریقوں میں بہت سی اصلاحیں ہوئی ہیں۔ خاص طور سے نئی لیس دار چیزوں اور خصوصاً پلاسٹک نے سلولائڈ کی جگہ لے لی ہے۔ مگر کانچ بنانے کا طریقہ بنیادی طور پر آج بھی کم و بیش وہی ہے جو چار ہزار سال پہلے تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ شیشہ آج ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہے ◻

یوں تو چوڑیاں سونے چاندی اور پلاسٹک کی بھی ہوتی ہیں لیکن کانچ کی چوڑیوں کا خوب صورتی میں آج بھی کوئی جواب نہیں

بھولے بھالو کی حماقتیں

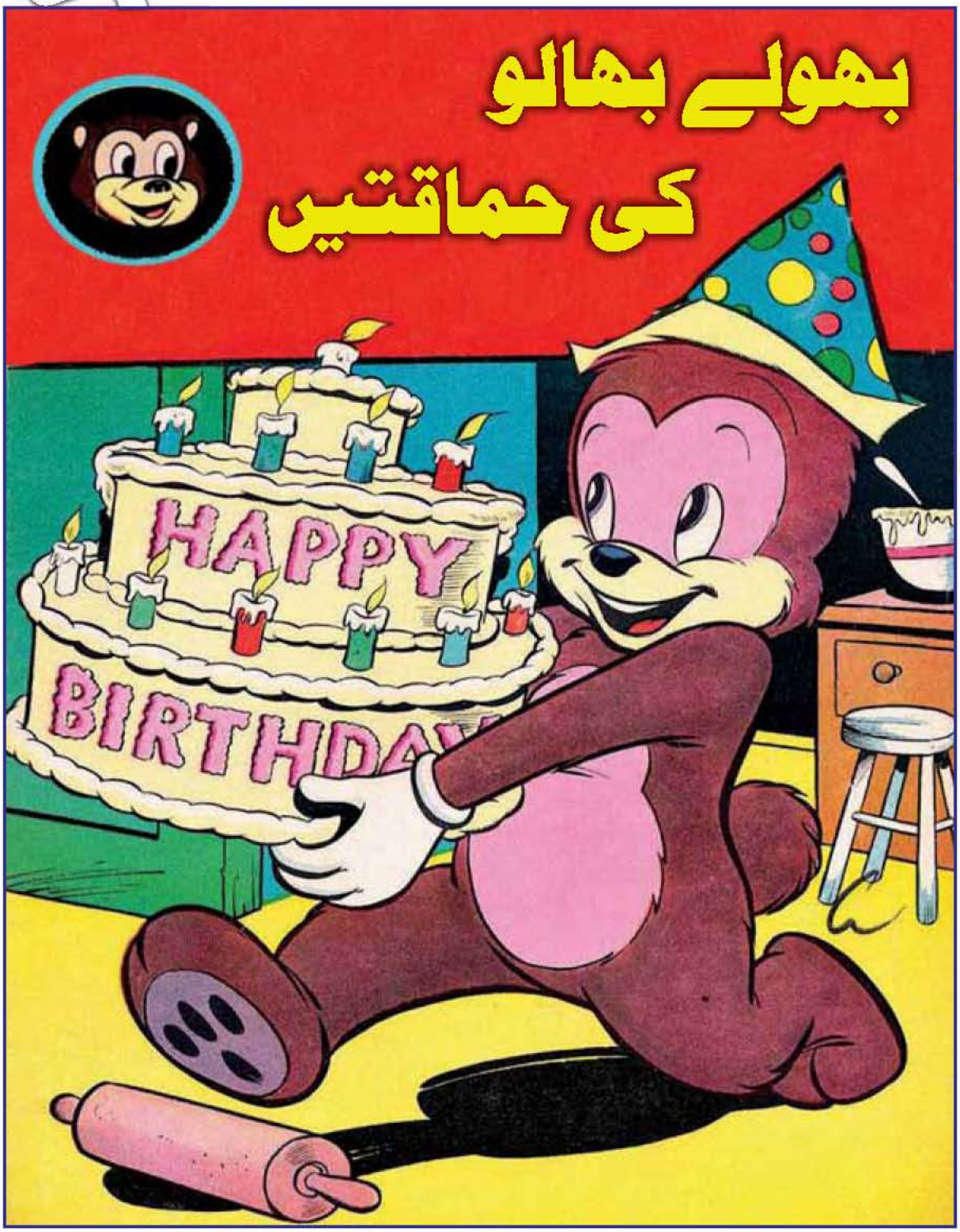

بھولا مرمّت ایجنسی

اس دروازے کی چرچراہٹ مجھے پاگل کردیتی ہے، تم جانتے ہو میں کتنا حساس ہوں
ہوسکتا ہے یہاں کوئی چوہا بس گیا ہو شاید تیل ڈالنا پڑے
اوہو، یہ گڑبڑ ہے! باڑے کا تختہ باہر نکل آیا ہے۔ایک منٹ میں ٹھیک کردیتا ہوں
ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مجھ سے شور برداشت نہیں ہوتا
بس یہ رسّی باندھ کر ذرا سا کھینچوں گا اور تختہ سیدھا ہوجائے گا
ذرا جلدی تمھاری موٹر سائیکل کا شور ناقابلِ برداشت ہے
یہ لو...
مر گیا..
کھٹاک
پھٹاک
ارے! یہ کیا ہوا؟ مسٹر جیٹ کہاں غائب ہوگئے؟
شاید شور سے بچنے کے لیے اندر چلے گئے ہیں۔چلو ان کے بغیر میں ٹھیک طرح کام کرسکوں گا
اف! رسّی تو ٹوٹ گئی! میرا خیال ہے میں موٹر بند کرنا بھول گیا

اے رکو! واپس آؤ! ابھی تو میں نے آخری قسط بھی ادا نہیں کی ہے!
پھٹ
پھٹ
اوہ! چلو یہ ٹھیک ہے، مسٹر بجیٹ کے گرین ہاؤس میں آجاؤ
ارے یہ ہرن کہاں سے نکل آیا؟
کم بخت! یہ میرے لان میں کیا کر رہے ہو؟
کیا کروں مسٹر بجیٹ، میری موٹر سائیکل بے قابو ہوگئی ہے
اف نہیں! میرے نایاب پھولوں کا کلکشن...
ارے بچو! وہ اسی طرف آرہی ہے ...دوڑو
بوم
پھٹاک

یا
ہو
او..
او..
اف
اف
اب یہ رکے گی نہیں! بریک ٹوٹ چکے ہیں
جلدی! دائیں مڑو! رفتار کم کرو، کوئی پیڑ ڈھونڈو، اب بائیں موڑ لو
زیادہ ہوشیار ہو تو خود ہی چلا لو!...
زوم
زوم
اوہو ہو! پیڑوں کے بیچ کیا کمال کی ڈرائیونگ کی ہے تم نے بھولے، میں نے تو آنکھیں ہی بھینچ لی تھیں
سچ پوچھو تو... میں نے بھی یہی کیا!
ہائیں!
تم بھی پورے احمق ہو! کیا تم نیچے شہر کی طرف جا رہے ہو؟
اب کہیں بھی جائیں کیا فرق پڑتا ہے ویسے بھی پہیے زمین سے اوپر ہیں
شہر کی طرف

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

غزل

□ ظہیر قدسی

مزاحیہ غزل

ہم اگر پڑھنے پڑھانے لگ جائیں
ہوش ٹیچر کے ٹھکانے لگ جائیں

چھٹیاں ملتے ہی بچے سارے
کھیل میں وقت گنوانے لگ جائیں

لاکھ محنت کریں بوڑھے طوطے
پاس ہونے میں زمانے لگ جائیں

اس قدر روئیں کہ روتے روتے
ساتھ میں سب کو رلانے لگ جائیں

نیٹ پر ایک کلک کے ذریعے
بچے ٹیچر کو سکھانے لگ جائیں

پہلی بارش میں بڑے بوڑھے بھی
ساتھ بچوں کے نہانے لگ جائیں

کھیل کے آخری حصے میں ظہیر
شرط ہر اک سے لگانے لگ جائیں

Mr Zaheer Qudsi 209, Shaniwar Ward, Azad Chowk, Near, Panch Qndeel,Malegoan-423203 Maha.

ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے

آؤ بچو ریل چلائیں

نانی کے صندوق سے کچھ عرصہ پہلے خود نانی سے ہی تعلق رکھنے والی ایک مزے دار نظم ہمیں ملی تھی 'نانی کی ناؤ چلی!' یہ نظم ہندوستان کے مشہور انگریزی شاعر اور بلبلِ ہند مسز سروجنی نائڈو کے چھوٹے بھائی ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے نے لکھی تھی۔ برسوں پہلے جب وہ خود ریڈیو پر بچوں کے پروگرام میں اپنے خاص انداز میں جھوم جھوم کر یہ نظم سناتے تو بچے پلک جھپکائے بغیر سنتے رہ جاتے تھے۔ بعد میں ایک فلم میں اسی طرز پر اشوک کمار نے بھی اسے گایا لیکن ہریندر ناتھ مرحوم کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان کی ایک اور اردو نظم ہمیں ملی ہے 'آؤ بچو ریل چلائیں'۔ اسے بھی اشوک کمار نے اسی فلم میں گایا تھا اور اس میں بھی لفظوں کے چناؤ سے تال اور سُر کی کیفیت پیدا کرنے کی ہریندر ناتھ جی کی خاص ادا صاف جھلکتی ہے۔ اب نہ وہ ریل گاڑیاں ہیں نہ چھک چھک کرنے والے بھاپ کے انجن۔ لیکن ذرا بلند آواز میں یہ نظم پڑھ کر دیکھیے۔ چند لمحوں میں آپ محسوس کریں گے جیسے ایک تیز رفتار ٹرین میں بیٹھے ہیں جو چھک چھک کرتی، پٹریاں بدلتی، چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی دوڑی چلی جا رہی ہے۔

آؤ بچو کھیل دکھائیں
چھک چھک کرتی ریل چلائیں
سیٹی دے کر سیٹ پہ بیٹھو

اک دو جے کی پیٹھ پہ بیٹھو
آگے پیچھے، پیچھے آگے
لائن سے لیکن کوئی نہ بھاگے
سارے سیدھی لائن میں چلنا
آنکھیں دونوں بیچ رکھنا
بند آنکھوں سے دیکھا جائے
آنکھ کھلے تو کچھ نہ پائے
منّی تم ہو ریل کا انجن
ڈبّو تم ہو کوئلے کا ڈبّہ
چنّو، منّو، لیلا، شیلا
موہن سوہن جادو مادھو
سب پسنجر سب پسنجر
ریل گاڑی ریل گاڑی
چھک چھک چھک چھک
چھک چھک چھک چھک
بیچ والے اسٹیشن بولیں
رک رک رک رک
رک رک رک رک
دھڑک بھڑک لوہے کی سڑک
دھڑک بھڑک لوہے کی سڑک
یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں
چھک چھک چھک چھک

چھک چھک چھک چھک
بھلائے چھاتی پار کر جاتی
بالو ریت آلو کے کھیت
باجرا دھان بڈھا کسان
ہرا میدان، مندر مکان
چائے کی دوکان
پل پگ ڈنڈی ٹیلے پہ جھنڈی
پانی کا کنڈ پنچھی کے جھنڈ
جھونپڑی جھاڑی کھیتی باڑی
بادل دھواں موٹھ کنواں
کنویں کے پیچھے باغ بغیچے
دھوبی کا گھاٹ منگل کی ہاٹ
گاؤں میں میلا بھیڑ جھمیلا
ٹوٹی دیوار ٹٹو سوار
ریل گاڑی ریل گاڑی
چھک چھک چھک چھک
چھک چھک چھک چھک
بیچ والے اسٹیشن بولیں
رک رک رک رک
رک رک رک رک
دھرم پور بھرم پور بھرم پور دھرم پور
مینگلور بینگلور بینگلور مینگلور

مانڈوا کھانڈوا کھانڈوا مانڈوا
رائے پور جے پور جے پور رائے پور
تالے گاؤں مالیگاؤں مالیگاؤں تالے گاؤں
نیلّور رویلّو رویلّو رنیلّور
شولا پور کولہا پور کولہا پور شولا پور
اتکل ڈنڈیگل ڈنڈیگل اتکل
مچھلی پٹم املی پٹم املی پٹم مچھلی پٹم
اڈگول نردگول نردگول اڈگول
کورے گاؤں گورے گاؤں
گورے گاؤں کورے گاؤں
ممدآباد، امدآباد، امدآباد، ممدآباد
شور پور کور پور، کور پور شور پور
چھک چھک چھک چھک
چھک چھک چھک چھک

بیچ والے اسٹیشن بولیں
رک رک رک رک
رک رک رک رک
دھڑک بھڑک لوہے کی سڑک
یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں
یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں
ریل گاڑی ریل گاڑی
ریل گاڑی ریل گاڑی

ڈرامہ

اقبال نیازی

نابینے موسیقار اور ڈاکو

ایک نابینا موسیقار کی کٹیا، دائیں طرف دروازہ اور نابینا موسیقار جہاں بیٹھ کر وہ بانسری بجاتا ہے۔ اس کی پشت پر دو کھڑکیاں ہیں جہاں سے پرندے اندر داخل ہوں گے۔ پردہ اٹھتا ہے تو نابینا موسیقار بانسری پر ایک خوبصورت سی دھن بجا رہا ہے۔ پرندے بنے ہوئے چھوٹے بچے کچھ دیر بعد ایک ایک کر کے اپنی چونچ میں مختلف پھل لیے کھڑکی سے داخل ہوتے ہیں اور پھلوں کو نابینا موسیقار کے سامنے رکھ کر بانسری سننے لگتے ہیں۔ نابینا موسیقار کچھ دیر تک بانسری بجاتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔

نابینا موسیقار: آ گئے تم لوگ...

پرندے: چوں، چوں، چوں..

پہلا پرندہ: تمہاری بانسری کی آواز آئی اور ہم آ گئے... چوں چوں چوں...

موسیقار: (ہنس کر) ارے میری ننھی ننھی چڑیوں میرے لیے اتنی تکلیف کیوں کرتی ہو؟

دوسرا پرندہ: ارے واہ... تکلیف کی کیا بات ہے؟ درخت سے ایک ایک پھل لانے میں کیسی تکلیف...؟ چوں چوں چوں۔

تیسرا پرندہ: اور اس کے بدلے تم ہمیں اتنی میٹھی بانسری جو سناتے ہو... چوں چوں چوں

چوتھا پرندہ: جیسے ہی ہمیں تمہاری بانسری کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ تمہیں بھوک لگی ہے۔ چوں چوں چوں

پہلا پرندہ: اور پھر ہم اڑ کر تمہارے پاس آجاتے ہیں.... چوں چوں چوں۔

موسیقار: (ہنس کر) اچھا اچھا... اب سچ مچ بھوک لگی ہے.... آؤ کچھ کھا لیتے ہیں۔

نابینا موسیقار پھل اٹھا کر کھاتا ہے.... پرندے بھی چونچ مار مار کر پھل کھاتے ہیں اور چوں چوں چوں کرتے رہتے ہیں...

موسیقار: بہت دیر ہوگئی ہے... میں بھی تھک گیا ہوں.... تمہیں بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں جانا چاہیے۔ تمہارے بچے انتظار کر رہے ہوں گے.. میں بھی سو جاتا ہوں۔

پرندے چوں چوں چوں کرتے ہوئے کھڑکیوں سے باہر چلے جاتے ہیں... نابینا موسیقار زمین پر لیٹ جاتا ہے.... روشنی دھیمی ہوتی ہے... ایک ڈاکو دائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چاقو چمک رہا ہے۔ وہ نابینا موسیقار کے قریب جا کر اس کے گلے پر چاقو رکھتا ہے۔ موسیقار نابینا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے...

موسیقار: کون ہے بھائی...؟

ڈاکو: (سخت لہجہ میں) میں ڈاکو ہوں۔ تمہارے پاس جو کچھ بھی ہو فوراً نکال کر میرے حوالے کر دو سمجھے...

موسیقار: میرے دوست! میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے ... پھر بھی یہاں جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے وہ سب لے لو... بس یہ میری بانسری چھوڑ دینا۔

ڈاکو: بکواس بند کرو۔ میں تمہارا دوست نہیں ہوں... سیدھی طرح سے جو کچھ تمہارے پاس ہے دے دو ورنہ اسی چاقو سے میں تمہاری جان لے لوں گا۔

موسیقار: ٹھیک ہے، تم مجھے مار سکتے ہو لیکن میری ایک گذارش ہے تم سے...

ڈاکو: جلدی بکو.. میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔

موسیقار: مجھے اپنی بانسری پر وہ دھن مکمل کر لینے دو۔ جو میں نے سونے سے پہلے ادھوری چھوڑی تھی، پھر تم مجھے چاہو تو مار دینا۔

ڈاکو: (بیزاری سے) ٹھیک ہے ٹھیک ہے، جلدی ختم کرو۔

ڈاکو کٹیا کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ نابینا موسیقار اپنی بانسری اٹھاتا ہے اور بجانا شروع کرتا ہے... پرندے کھڑکی سے ایک کے بعد ایک چونچ میں پھل لیے داخل ہوتے ہیں اور پھل سامنے رکھ کر غور سے سننے لگتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔

پہلا پرندہ: چوں چوں چوں... تم نے تو کہا تھا تم سو رہے ہو... پھر اتنی رات میں یہ بانسری؟

دوسرا پرندہ: شاید تمھیں پھر سے بھوک لگی ہے... نیند سے اٹھ کر آئے ہیں ہم... چوں چوں چوں۔

موسیقار: ارے میری پیاری چڑیوں! مہمان آئے ہیں۔ اس لیے تمھیں تکلیف دی۔ وہ دیکھو یہیں پر ہیں۔

ٹٹولتے ہوئے پھل اٹھا کر ڈاکو کی طرف بڑھاتا ہے

موسیقار: تم میری کٹیا میں آئے ہو... میرے مہمان ہو... اس سے پہلے کہ تم مجھے مار دو.... یہ پھل کھالو... میں تمھیں اس کے علاوہ کچھ نہیں کھلا سکتا دوست! مہربانی کر کے یہ کھالو.... تم بھوکے ہو گے...

ڈاکو حیرت سے کبھی چڑیوں کو دیکھتا ہے... کبھی نابینا موسیقار کو اور کبھی پھلوں کو.... اور پھر اپنے آپ سے کہتا ہے:

ڈاکو: کیا میں اتنا برا ہوں...؟ اتنا خود غرض....؟ یہ ننھے پرندے اس کے لیے پھل لے کر آئے ہیں کیوں کہ وہ اس کی میٹھی بانسری سنتے ہیں اور میں؟... میں نے بھی اتنی دیر اس کی بانسری سنی اور میں اس کی جان لے رہا ہوں؟ مجھے شرم آنی چاہیے... میں گناہ گار ہوں... یہ میں کیا کر رہا ہوں...؟

موسیقار: کیا سوچ رہے ہو بھائی: ؟ لو یہ پھل کھالو.... پھر چاہو تو مجھے مار دینا...

پرندے: چوں چوں... چوں چوں...

ڈاکو اپنے ہاتھ سے چاقو پھینک دیتا ہے اور نابینا موسیقار کے قدموں میں جھک جاتا ہے

ڈاکو: مجھے معاف کر دو موسیقار... میں خود غرض ہو گیا تھا... ان ننھے پرندوں نے مجھے سبق سکھایا ہے۔۔ میں آج سے لوٹ مار بند کر دوں گا.... ہمیشہ کے لیے... آج سے میں تمہارے ساتھ رہوں گا... تمہاری خدمت کروں گا... کیا تم مجھے بھی بانسری بجانا سکھاؤ گے... سکھاؤ گے نابابا؟

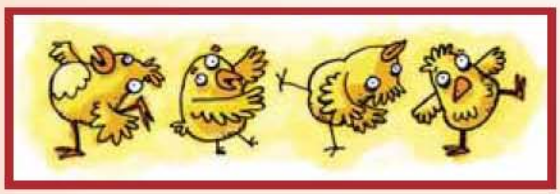

پرندے: (خوشی سے) چوں چوں چوں چوں...

نابینا موسیقار ڈاکو کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور بانسری اٹھا کر ایک خوشگوار دھن بجاتا ہے، کٹیا میں پرندے اور ڈاکو ساتھ ساتھ ناچنے لگتے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے۔ □

مرکزی خیال انگریزی نظم سے

Mr Iqbal Niyazi, LIG Colony 3rd Flr
Vinoba Bhave Nagar, Kurla (West) Mumbai-400070

قسط وار داستان

پہلی قسط

روبنسن کروسو

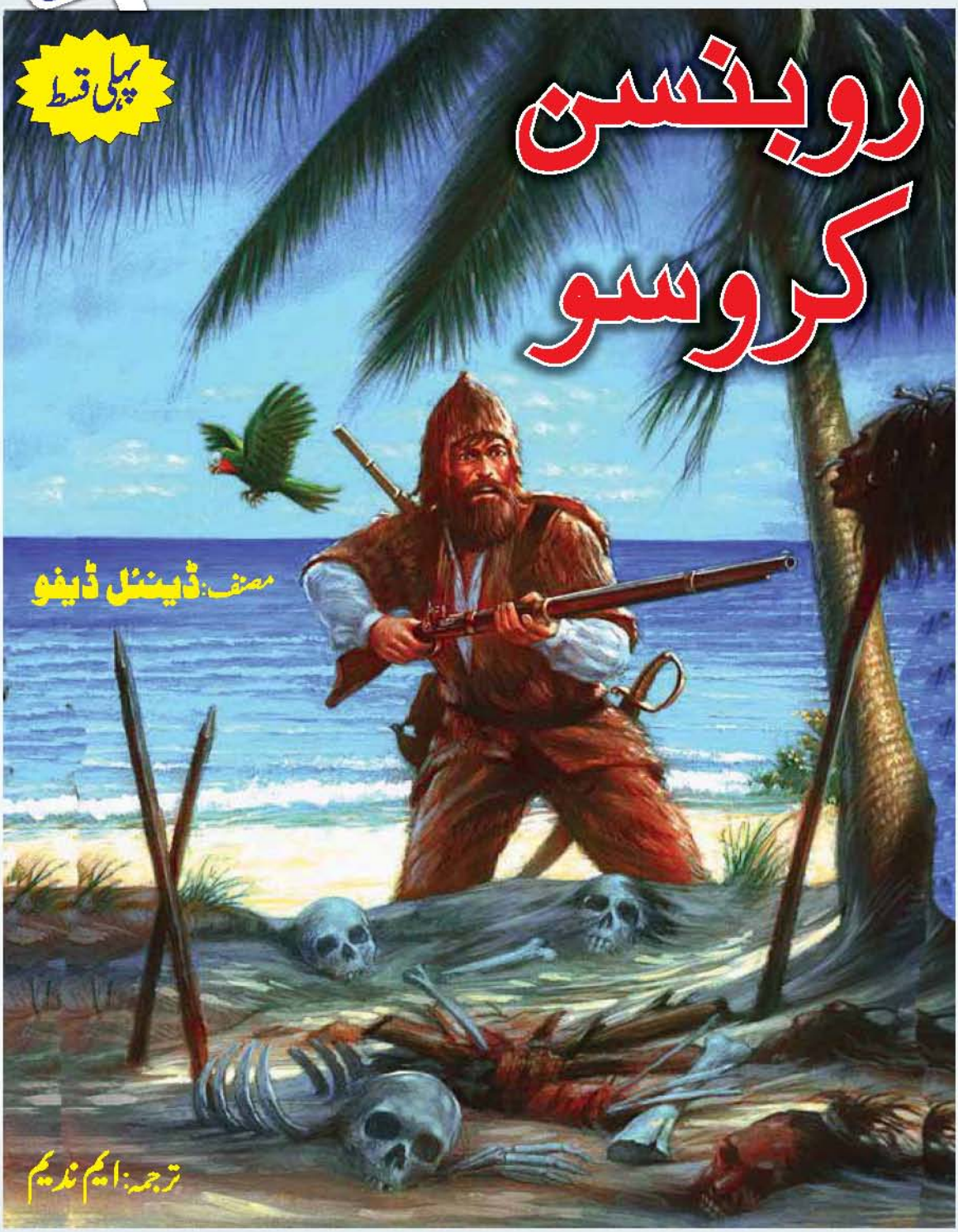

مصنف: ڈینئل ڈیفو

ترجمہ: ایم ندیم

'رابنسن کروسو' انگریزی مصنف ڈینیل ڈیفو Daniel Defoe کا لکھا ہوا مشہور ناول ہے جو سب سے پہلے 25 اپریل 1719 کو چھپا تھا۔ مصنف کا نام اس میں رابنسن کروسو دیا گیا تھا جب کہ اصل میں یہ ڈیفو کے ناول کا خیالی اور مرکزی کردار تھا جو اپنی زندگی کے حیرت انگیز واقعات کو سچا بتا کر اپنی داستان سناتا ہے۔ کتاب کا اصل نام کافی طویل تھا:

The Life and Strange Surprizing Adventures of Robinson Crusoe, Of York Mariner: Who lived Eight and Twenty Years, all alone In an un-Inhabited Island on the Coast of America, near the Mouth of the Great River of Oroonoque; Having been cast on Shore by Shipwreck, wherein all the Men perished but himself. With An Account how he was at last as strangely deliver'd by Pyrates

پڑھنے والوں نے اسے سچی کہانی سمجھا لیکن یہ تمام تر خیالی قصوں کا مجموعہ تھا۔ بنیادی کہانی اسکاٹ لینڈ کے باشندے الیگزینڈر سیلکرک Alexander Selkirk کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی جو 1676 میں پیدا ہوا تھا، اپنے وقت کا مشہور ملاح تھا اور سمندر میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی سے متاثر ہو کر تشکیل دیے گئے کردار رابنسن کروسو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ 1966 میں بحرالکاہل کے اُس جزیرے 'ماسا تیمرا' کا نام رابنسن کروسو رکھ دیا گیا جہاں سیلکرک چار سال تک رہا تھا۔

ڈینیل ڈیفو

کتاب کا مصنف ڈینیل ڈیفو 1960 میں لندن میں پیدا ہوا اور 24 اپریل 1731 کو اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بیک وقت ایک تاجر، مصنف، صحافی اور جاسوس تھا۔ وہ ان مصنفوں میں شامل ہے جنھوں نے انگریزی ادب کے بہت سے جانکار 'رابنسن کروسو' کو بڑا ہی زود نویس مصنف تھا۔ اس نے بہت لکھے جن کی تعداد 500 سے زیادہ ہے اور شادی بیاہ اس کی تحریروں کے چند موضوعات ہیں۔ ناول 'رابنسن کروسو' اس کی سب سے مشہور تصنیف ثابت ہوا جس پر کئی فلمیں بن چکی ہیں، دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور بے شمار کامکس اسٹرپ بنائے جا چکے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے پہلی بار 1978 میں اس کی تلخیص اردو میں شائع کی جس کا ترجمہ جناب ایم ندیم نے کیا تھا۔ آیئے اس دل چسپ اور حیرت انگیز واقعات سے بھری ہوئی داستان کا قسط وار مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ اعزازی مدیر

پہلا سفر

میرا نام رابنسن کروسو ہے۔ میں 1632 میں یارک شہر میں پیدا ہوا تھا۔ میرے باپ ایک دولت مند تاجر تھے، میرے دو بڑے بھائی اور تھے۔ سب سے بڑا بھائی تو فوج میں بھرتی ہوا اور ایک جنگ میں کام آیا، لیکن دوسرے بھائی کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلا گیا اور اس نے کون سا پیشہ اختیار کر لیا۔

کیونکہ میں اپنے باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اس لیے میرا بچپن بڑے لاڈ اور پیار میں گزرا۔ میرے باپ نے میری تعلیم کا معقول انتظام کیا تھا۔ میرے باپ کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر وکیل بنوں لیکن میرا دل پڑھنے لکھنے میں بالکل بھی نہیں لگتا تھا۔ بہر حال جب میں بڑا ہوا تو میرے دل میں دنیا کی سیر کرنے کی امنگ پیدا ہوئی، میرا جی چاہتا تھا کہ میں کسی جہاز کا کپتان بن کر دیس بدیس کی خوب سیر کروں اور دنیا کے عجائبات دیکھوں۔ میرے ماں باپ کو جب میرے خیالات معلوم ہوئے تو انھوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں یہ باتیں

اپنے ذہن سے نکال ڈالوں اور ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاؤں۔ لیکن میں نے ان کا کہنا نہیں مانا اور وہی کیا جو میں چاہتا تھا۔ اپنے ماں باپ کی نافرمانی کر کے میں نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائیں جن کا بیان آگے آئے گا۔

میرے والد ایک تجربہ کار انسان تھے۔ وہ بہت دنوں سے گٹھیا کے مرض میں مبتلا تھے اور بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا:

''میرے پیارے بیٹے! پردیس میں جانے سے تم کو سوائے پریشانیوں اور مصیبتوں کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اپنے وطن میں تھوڑی سی محنت کر کے تمھیں دولت اور عزت دونوں مل سکتی ہیں اور تم آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہو۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہی اپنے وطن کو چھوڑ کر پردیس جانے پر مجبور ہوتے ہیں، ایک تو کنگال جن کو اپنے وطن میں ایک وقت کی روٹی بھی نہیں مل پاتی، دوسرے وہ لوگ جو بہت زیادہ دولت مند ہوتے ہیں اور اپنی دولت سے لوگوں میں مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ تم نہ تو بہت مفلس ہو اور نہ بہت دولت مند ہو، بلکہ درمیانی حالت میں ہو، اسی درمیانی حالت میں آدمی کو سکون اور خوشی ملتی ہے اور ہوس کرنے والا انسان نقصان اٹھاتا ہے۔''

بہت دیر تک میرے والد مجھے سمجھاتے رہے۔ انھوں نے کچھ ایسی شفقت اور محبت بھرے انداز میں مجھے سمجھایا کہ میرا دل بھر آیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے شفیق باپ کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا اور اپنے کاروبار میں خوب دل لگا کر کام کروں گا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد میرا دل اچاٹ ہو گیا اور دنیا کی سیر کے لیے مچلنے لگا۔ اس بار میں نے اپنے باپ سے کچھ نہیں کہا۔ اپنی ماں سے اپنے دل کا حال بیان کیا اور کہا کہ وہ والد سے میری سفارش کر دیں اور مجھے سفر کی اجازت دلا دیں۔

امی یہ سن کر بہت ناخوش ہوئیں اور بولیں کہ میں ایسی باتیں کر کے تمہارے بیمار باپ کو ہرگز پریشان نہیں کروں گی۔ لیکن بعد میں میری ماں نے ساری باتیں میرے باپ سے کہہ دیں۔ جو یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور بولے۔

''میرے جس بیٹے نے میرا کہا نہ مانا اس نے بہت نقصان اٹھایا اور مصیبتوں میں پڑا۔ میں کسی بھی صورت میں رابنسن کو پردیس جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

اس دن سے میرے باپ مجھ سے ناراض سا رہنے لگے اور میں بھی کچھ بددل سا ہو گیا۔ اس طرح ایک سال بیت گیا۔

اتفاق سے ایک دن کام کے سلسلے میں، میں ہل شہر گیا، جہاں میری ملاقات اپنے ایک بچپن کے دوست سے ہو گئی، جو اپنے باپ کے جہاز پر لندن جا رہا تھا۔ اس ملاقات نے میرے سفر کے شوق کو پھر تیز کر دیا۔ میرے دوست نے کہا کہ میں اس کے ساتھ بلا کسی خرچ کے ایک لمبا سفر کر سکتا ہوں یعنی مفت میں لندن کی سیر کر سکتا ہوں۔ میں فوراً تیار ہو گیا اور اپنے ماں باپ سے اجازت لیے بغیر روانہ ہو گیا۔ میں نے انہیں اپنے جانے کی اطلاع بھی نہیں دی۔

وہ یکم ستمبر 1651 کا منحوس دن تھا جب میں جہاز پر سوار ہوا۔ یہاں سے میری مصیبتوں کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں میں نے جیسی سخت مصیبتوں کا سامنا کیا، خدا وہ مصیبتیں کسی دشمن کو بھی نہ دے۔

جب جہاز سمندر میں پہنچا تو ایک طوفان آیا اور سمندر کی موجیں پہاڑ کی مانند اونچی اٹھنے لگیں۔ کیونکہ میرا سمندر کا پہلا سفر تھا اس لیے ڈر کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں نے اپنے ماں باپ کی نافرمانی کی ہے اور اسی کی مجھے سزا مل رہی ہے۔ میں روتا تھا اور گڑگڑا کر خدا سے دعا کرتا تھا کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے دے اور یہ کہ اگر اس طوفان سے زندہ بچ گیا تو آئندہ کبھی بھول کر بھی

جہاز پر قدم نہیں رکھوں گا اور ہمیشہ اپنے ماں باپ کی خدمت کروں گا۔

دوسرے دن جب ذرا طوفان تھما اور سمندر میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تو میری طبیعت بھی کچھ سنبھل گئی۔ ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا نے میری گھبراہٹ اور پریشانی کو ختم کر دیا۔ میں تمام رات بہت آرام سے سویا اور صبح بہت خوش خوش اٹھا۔ میں نے دور تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھا، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ایک دن پہلے والا سمندر ہے۔

میرے دوست نے جب مجھے خوش دیکھا تو مجھے چھیڑا اور کہا:

''یار کل تو تمہارا ڈر کے مارے برا حال تھا، ایسے چھوٹے چھوٹے طوفان اتنے بڑی جہاز کے لیے معمولی باتیں ہیں، کیونکہ یہ تمہارا سمندر کا پہلا سفر ہے اس لیے تم ڈر رہے ہو، خیر فکر مت کرو، سفر کرتے کرتے تم بھی میری طرح نڈر ہو جاؤ گے۔''

اس پر میں نے تعجب سے کہا: ''ارے تم اس طوفان کو معمولی بتاتے ہو، میں تو اپنی زندگی سے بھی مایوس ہو گیا تھا۔''

میرا دوست بہت ہنسا اور بولا'' تم ابھی اناڑی ہو۔''

ہم دونوں نے اس روز بہت عمدہ کھانا کھایا اور خوب گپ شپ کی۔ اس طرح میں نے پچھلی مصیبت کی یاد کو بھلا دیا۔ ایک ہفتہ بیت گیا۔ میں اب مطمئن تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ ابھی ایک اور بھی بڑی مصیبت میرا انتظار کر رہی ہے۔

سفر کے ساتویں دن سے ہوا نا موافق چلنے لگی۔ مجبوراً بارمتھ شہر کی بندرگاہ کے قریب جہاز کو لنگر ڈالنا پڑا۔ یہ جگہ جہازوں کے لیے بہت محفوظ تھی۔ اس وقت بھی وہاں تین چار جہاز کھڑے تھے۔ ہوا بڑی تیز ہوتی جا رہی تھی، جہاز کے رسّے بہت مضبوط تھے، اس لیے کپتان اور ملاح مطمئن تھے۔ لیکن جب ہوا بہت تیز ہو گئی تو جہاز کے بادبان اتار دیے گئے اور ساری کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ اس ہولناک طوفان نے ملاحوں کو پریشان کر دیا۔ وہ ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے اور جہاز کو بچانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

میں اپنے کیبن کے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پہلے کی طرح یہ طوفان بھی گزر جائے گا۔ لیکن جب میں نے باہر نکل کر دیکھا تو میں کانپ اٹھا۔ موجیں پہاڑ کی مانند اونچی اٹھ رہی تھیں اور جہاز لہروں کے ساتھ بار بار اٹھتا تھا اور نیچے گرتا تھا۔ ہمارے جہاز سے ذرا فاصلے پر ایک جہاز ڈوب رہا تھا۔ ملاح کہتے تھے کہ انھوں نے ایسا ہولناک طوفان زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا، حالانکہ ہمارا جہاز بہت مضبوط تھا لیکن اس وقت اس کی حالت سمندر میں ایک تنکے کے مانند ہو رہی تھی۔

آدھی رات کے وقت جہاز کے پچھلے حصے میں پانی بھرنے لگا اور تھوڑی دیر میں تین ہاتھ پانی بھر گیا۔ سب لوگوں نے مل کر پانی نکالنا شروع کیا۔ خطرے کا اعلان کرنے اور مدد کے لیے جہاز سے توپ چھوڑی گئی۔ اس کی آواز سن کر ایک جہاز نے ہماری مدد کے لیے کشتی بھیج دی لیکن طوفان میں اس کشتی کا ہمارے جہاز تک پہنچنا اور پانی میں ٹھہرنا مشکل تھا۔ جیسے تیسے کر کے وہ ہمارے قریب آئی تو رسوں کی مدد سے ہم لوگ کشتی پر چڑھ گئے اور بڑی پریشانیوں کے بعد کنارے پر پہنچے۔ اس دوران ہمارا جہاز ڈوب چکا تھا۔

لٹیروں کی قید میں

بارمتھ شہر کے لوگوں نے ہماری بہت مدد کی۔ ہمیں ٹھہرنے کو جگہ دی، کھانا دیا اور ہم مصیبت کے ماروں کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ یہی نہیں ان لوگوں نے مسافروں کو ہل شہر اور لندن تک کا کرایہ بھی دیا۔ میری بدقسمتی تھی کہ میں اتنی بڑی مصیبت اٹھا کر بھی اپنے ماں باپ کے پاس نہیں گیا۔

اپنے جہازی دوست کے باپ سے جب میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے جہاز پر یہ ساری تباہی میری وجہ سے آئی تھی کیوں کہ میں اپنے ماں باپ کی اجازت لیے بغیر اس کے جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً اپنے گھر واپس چلا جاؤں کہ اسی میں میری بھلائی ہے۔

کاش میں اسی وقت اپنے باپ کے پاس چلا جاتا۔ والد مجھے زندہ اور صحیح وسلامت پا کر بہت خوش ہوتے مجھے سینہ سے چمٹا لیتے اور مجھے یقین ہے کہ میرا قصور بھی معاف کر دیتے۔ یہی نہیں میرے آنے کی خوشی میں ایک بڑی دعوت بھی کرتے لیکن میں گھر نہیں گیا۔ دراصل مجھے ایسی حالت میں گھر جاتے ہوئے اور باپ کا سامنا کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ کبھی کبھی جھوٹی شرم آدمی سے اس کا گھر بار ہمیشہ کے لیے چھڑا دیتی ہے۔

لندن آ گیا، میں نے ملک گنی کو جانے کا فیصلہ کیا۔ گنی کو لوگ سونے کا ملک بھی کہتے ہیں۔ میری ملاقات لندن میں ایک نیک دل اور ایمان دار جہاز مالک سے ہوئی جو کئی بار ملک گنی ہو آیا تھا، اور تجارت میں کافی نفع کما چکا تھا۔ وہ مرا دوست بن گیا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کے ساتھ سوداگری کا سامان لے چلوں۔ سارا منافع میرا ہی ہوگا۔ وہ اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ میرے باپ نے اپنے دوستوں کی سفارش پر میرے لیے کچھ رقم بھجوادی تھی۔ میں نے اس رقم سے کھلونے، چاقو اور دوسری سوداگری کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں اور اس سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس مہربان دوست سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا۔ اس نے مجھے جہاز رانی سے متعلق بہت سی معلومات دیں اور تجارت کے گر سکھلائے۔ وہ نہ صرف میرا اچھا دوست تھا بلکہ استاد بھی تھا۔ اس طرح میں اس کی مدد سے ایک اچھا سوداگر بھی بن گیا اور جہاز چلانے کے فن سے بھی واقف ہو گیا۔

گنی کے سفر سے مجھے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ میں نے تین سیر سونا جمع کر لیا۔ اس سونے کو میں نے لندن میں تیس ہزار پونڈ میں فروخت کیا۔ میرا یہ دوست ایک بار بیمار پڑا اور مر گیا۔ مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ میں نے ان تین ہزار پونڈ میں سے دو ہزار اپنے مرحوم دوست کی بیوہ کے پاس رکھ دیے اور ایک ہزار پونڈ کا سامان لے کر دوبارہ ملک گنی کے سفر کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن اس سفر میں مجھ پر عجیب آفت آئی۔

جب ہمارا جہاز کنیری ٹاپو کے قریب پہنچا تو ہم پر سمندری لیٹروں نے حملہ کر دیا۔ ہم نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، دو بار تو ان لیٹروں کو اپنے جہاز سے بھگا بھی دیا لیکن بدقسمتی سے ہمارا جہاز ٹوٹ گیا اور لیٹروں نے ہمارے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے کچھ ساتھی زخمی ہوئے اور کچھ مارے بھی گئے۔ باقی کو قید کر لیا گیا۔ قیدیوں کو سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں اسی کمبخت سردار کے حصے میں آیا۔

میں اپنی اس حالت کو دیکھ کر رو پڑا کہ کہاں تو میں ایک سوداگر تھا اور کہاں اب ایک غلام بن گیا۔ اس وقت مجھے اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی۔

میرے مالک نے مجھے گھر کے کام کاج کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ کبھی میرا مالک مجھے اپنے ساتھ سمندر میں لے چلے اور وہاں اس کی لڑائی اسپینیوں یا پرتگالیوں سے ہو اور میرا مالک مارا جائے یا پکڑا جائے تو میں آزاد ہو جاؤں۔ لیکن میری یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی کیوں کہ سمندر میں دوسرے لیٹروں کے ساتھ جاتے وقت میرا سردار مجھے کبھی نہیں لے جاتا تھا۔ بلکہ وہ مجھے اپنے باغ اور گھر کی رکھوالی کے لیے چھوڑ جاتا تھا۔

میرے دماغ میں رہائی پانے کا خیال ہر وقت چکر لگاتا رہتا تھا۔

میں مناسب موقع کی تلاش میں تھا، لیکن دو سال تک مجھے کوئی ایسا موقع ہاتھ نہیں آیا۔ دو سال بعد خدا نے میری سن لی۔ ہوا یہ کہ ایک دن میرے مالک نے دو تین مہمانوں کے ساتھ مجھے مچھلی کا شکار کھیلنے کا پروگرام بنایا اور کھانے پینے کی بہت ساری اچھی اچھی چیزیں چھوٹی کشتی میں رکھوادیں اور مجھے حکم دیا کہ دو تین بندوقیں اور چھرے، بارود سبھی کشتی میں لاکر رکھ دو تا کہ وہاں سمندری پرندوں کا بھی شکار کرسکیں۔ میں نے سارا سامان کشتی میں رکھ دیا اور کشتی کو دھودھا کر تیار کرلیا۔

تھوڑی دیر بعد مالک آیا اور بولا کہ ضروری کام کی وجہ سے وہ اور اس کے مہمان شکار کھیلنے نہ جاسکیں گے۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ دو اور غلاموں کو لے کر جاؤں اور جلدی مچھلیاں پکڑ کر واپس آجاؤں کیوں کہ مہمانوں کو دعوت میں مچھلیاں کھلانی ہیں۔

میں یہ سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔

میں نے اپنے ساتھی غلام سے کہا کہ ہم لوگ کھانے پینے کا سامان کشتی میں رکھ لیں نہ جانے کیا ضرورت آن پڑے۔ چنانچہ ایک ٹوکری روٹی، تین چار صراحی پانی وغیرہ کشتی میں رکھ دیا۔ اس کے علاوہ میں نے نظر بچا کر بہت سارا موم، سوت کا ایک پنڈا، ایک بسولہ، آری، ہتھوڑا وغیرہ سبھی رکھ لیے۔ اس کے علاوہ سمندری پرندے مارنے کے بہانے تھوڑے چھرّے، بارود سبھی رکھے۔ جب ضرورت کی تمام چیزیں تیار ہوگئیں تو میں نے کشتی کھول دی میرے ساتھ جو دو غلام تھے ان میں ایک لڑکا سا تھا اس کا نام ژدری تھا اور دوسرا مولا تھا۔

جب ہماری کشتی ساحل سے ڈیڑھ میل دور نکل گئی تو میں نے موقع پا کر مولا کو سمندر میں پھینک دیا۔ وہ غوطے کھا کر تیرنے لگا اور گڑگڑانے لگا کہ کشتی پر بٹھالوں، مگر میں نے اس سے کہا کہ وہ تیرنا جانتا ہے کنارہ بھی دور نہیں ہے، اور اگر وہ نہیں مانے گا تو میں اسے گولی ماردوں گا۔

مولا میرے تیور دیکھ کر سہم گیا اور کشتی کا پیچھا کرنے کے بجائے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ دوسرا لڑکا یہ دیکھ کر ڈر گیا اور میرے پیروں پر گر پڑا اور قسمیں کھانے لگا کہ وہ میرا وفادار رہے گا اور کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔ مجھے اس کی قسموں پر اعتبار آگیا۔ چنانچہ میں نے اس کو تاکید کی کہ اگر اس نے میرے کہنے پر عمل کیا تو ایک دن میں اسے آزاد کردوں گا، اور اگر اس نے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو پھر سخت سزا دوں گا۔

جب مولا میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں نے اپنی کشتی کا رخ جنوب کی سمت کردیا۔ دوسرے دن تین بجے تک ہم نے اسّی میل کا سفر طے کرلیا تھا۔ ہوا موافق تھی، اس لیے ہمارا سفر پانچ دن تک مسلسل جاری رہا۔ کبھی کبھی میٹھے پانی کی تلاش میں ہم کنارے پر کشتی کو ٹھہرا لیتے تھے۔ ایک بار ہم نے بندوق سے ایک بڑے شیر کا شکار کیا اور اس کی کھال اتار کر کشتی پر سوکھنے کو ڈال دی۔ کھانے پینے کا سامان ہمارے پاس بہت کم تھا، اس لیے ہم بہت تھوڑا کھا کے گزارہ کررہے تھے۔

میرا خیال تھا کہ راستہ میں کوئی تجارتی جہاز ضرور مل جائے گا۔ لیکن اب تک ہمیں کوئی جہاز نظر نہ آیا تھا۔ کھانے کا سامان بھی اب ختم ہونے والا تھا۔

ایک دن میں پریشان سا کشتی کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا تھا کہ ژدری چلایا۔ ''صاحب جہاز!!''

وہ جہاز دیکھ کر ڈر گیا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ ہمارے مالک نے ہمیں پکڑنے کے لیے شاید جہاز بھیجا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اتنی دور وہ کوئی جہاز نہیں بھیجیں گے۔ یہ جہاز تو ایک تجارتی جہاز تھا جو شاید تجارت کا سامان لے کر ملک گنی کی طرف جارہا تھا۔

یہ جہاز ہماری کشتی سے کافی دوری پر تھا اور ہماری طرف نہیں آرہا تھا۔ ہم نے کشتی کو جہاز تک لے جانے کی پوری کوشش کی لیکن جہاز کی

رفتار ہماری کشتی کی رفتار سے بہت زیادہ تھی اور جہاز برابر ہم سے دور ہوتا جارہا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا لیکن خوش قسمتی سے جہاز کے کپتان نے ہماری کشتی کو دوربین سے دیکھ لیا اور ہمیں مصیبت کا مارا جان کر جہاز کی رفتار کم کرنے کے لیے کئی پال اتروادیے۔ میں نے کشتی پر جھنڈا چڑھادیا اور بندوق سے فائر کیا تاکہ انھیں ہمارے مصیبت میں ہونے کا علم ہوجائے۔ ہم اپنی کشتی کو جہاز کی طرف لے چلے اور تین گھنٹے میں جہاز تک پہنچ گئے۔

میں نے کپتان کو اپنی مصیبت کی ساری داستان سناڈالی کہ میں کس طرح سمندری لیٹروں کے ہاتھ لگا اور کس طرح ان کی قید سے رہائی پائی اور یہاں تک پہنچا۔ میرا سارا سامان جہاز پر چڑھایا گیا۔

اتنی مدت کے بعد اور غلامی کی زندگی گزارنے کے بعد آزاد ہوکر میں بہت خوش تھا۔ یہ ایسی خوشی تھی کہ اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ میں نے اس خوشی میں اپنا سارا سامان جہاز کے کپتان کی نذر کرنا چاہا۔ لیکن اس نیک آدمی نے میری کوئی بھی چیز قبول نہیں کی اور کہا کہ جس طرح میں نے مصیبت میں تمہاری مدد کی ہے اسی طرح خدا بھی میری مدد کرے گا۔ یہی میرا انعام ہے۔ اس نے میری ساری چیزوں کی فہرست بنائی یہاں تک کہ مٹی کے گھڑے بھی لکھ لیے اور سارا سامان حفاظت کے ساتھ رکھوادیا۔ جہاز کے ملاحوں کو تاکید کردی کہ میری کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں اور نہ ہی کوئی چیز تحفے میں قبول کریں۔ کپتان نے مجھ سے کہا کہ وہ برازیل تک مجھے مفت جہاز پر لے جائے گا اور کوئی کرایہ نہیں لے گا۔

برازیل پہنچنے پر جہاز کے مالک نے مجھ سے کرایہ نہیں لیا اور نہ ہی کوئی چیز تحفہ میں قبول کی۔ بلکہ میری کشتی اور شیر کی کھال کی معقول قیمت مجھے ادا کردی۔ میں ژوری کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن جہاز کے مالک نے یہ شرط رکھی کہ وہ ژوری کو خریدنا چاہتا ہے اور دس سال بعد اسے آزاد کردے گا تو میں نے اس کی یہ شرط مان لی۔ ژوری نے بھی جہاز کے مالک کے پاس رہنا منظور کرلیا۔ اس طرح اب میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی تھی۔

میرا ارادہ برازیل میں شکر بنانے کا کارخانہ چلانے کا تھا۔ یہاں پر شکر کے کاروبار سے معمولی لوگ بھی بہت مالدار ہوگئے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرے رہنے کا انتظام ایک نیک آدمی کے یہاں ہوگیا۔ میں نے یہاں رہ کر شکر بنانے کا فن سیکھا۔ سب سے پہلے میں نے تھوڑی زمین خریدی اور اس پر تمباکو کی کاشت کی اور اس کے بعد گنا بودیا۔

وہ جہاز جس پر میں برازیل تک پہنچا تھا تین ماہ تک برازیل میں ٹھہرا رہا۔ ان تین مہینوں میں میں نے اپنی کھیتی کا سارا انتظام کرلیا تھا۔ اب یہ جہاز لندن جارہا تھا۔ میں نے اپنے دوست، جہاز کے مالک سے درخواست کی کہ وہ ایسی تدبیر کرے کہ میری رقم جو لندن میں ہے مجھے یہاں مل جائے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں لندن سے آدھی رقم منگواؤں اور آدھی وقت ضرورت کے لیے لندن ہی میں چھوڑ دوں، اور بجائے رقم منگوانے کے وہ سامان منگواؤں جو میرے کاروبار کے لیے فائدہ مند ہو۔ مجھے اس کی یہ تجویز پسند آئی۔ میں نے جہاز کے کپتان کے نام ایک مختار نامہ لکھ دیا کہ میری رقم اس کو دے دی جائے۔ ایک خط اپنے مرحوم دوست کی بیوہ کے نام لکھا جس کے پاس میں لندن میں دو ہزار پونڈ رکھ آیا تھا۔ اس خط میں میں نے اسے اپنا سارا حال بھی لکھ دیا اور جہاز کے مالک کی مہربانیوں کا ذکر بھی کردیا جس کی مدد سے میں برزایل تک پہنچ سکا، اور اسے انیجیج شدہ رقم میں سے ایک ہزار پونڈ دے دینے کی درخواست کی۔ یہ دونوں خط میں نے جہاز کے مالک کو دیدیے۔

میرے دوست نے لندن سے روپیہ حاصل کرکے میری

ضرورت کی بہت ساری چیزیں خریدیں اور مجھ تک بھجوادیں۔ یہ سامان ملنے پر مجھے بہت اطمینان ہوگیا اور اب میں ایک دولت مند آدمی بننے کا خواب دیکھنے لگا۔ مجھے اپنے کاروبار میں بہت فائدہ ہوا اور جو لاگت میں نے لگائی تھی، تھوڑے دنوں میں میرے پاس اس سے چوگنی رقم جمع ہوگئی۔ میں نے دو تین نوکر بھی رکھ لیے۔ میں چار سال تک برزایل میں رہا۔ میں نے یہاں کی زبان سیکھ لی اور بڑے بڑے تاجروں سے میرے تعلقات ہوگئے تھے اور لین دین رہتا تھا۔

میرے دماغ میں اب بہت دولت مند بننے کا خبط سمایا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جو آدمی لالچ میں پڑتا ہے اور اپنی طاقت سے زیادہ کام کرنے کی سوچتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر میں اس وقت اپنے اسی کام میں لگا رہتا اور صبر و شکر کے ساتھ موجودہ حالت پر ہی قناعت کیے رہتا تو یقیناً مصیبتوں سے بچ جاتا۔ لیکن لالچ اور ناسمجھی نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

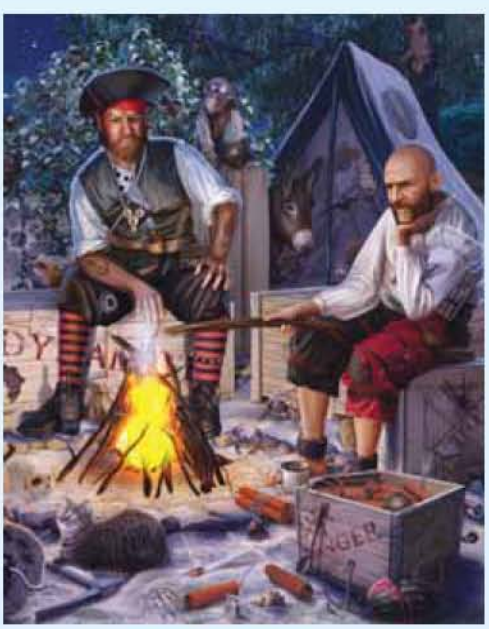

ایک بار میں نے اپنے دوستوں سے اپنے سفر کے حالات بیان کیے اور جو جو ملک میں نے دیکھے تھے ان کے بارے میں بتایا، انھوں نے خاص کر ملک گنی اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ تجارت کے حال کو بہت غور سے سنا۔ وہ لوگ یہ سن کر بہت متاثر ہوئے کہ کاخری باشندوں سے چاقو چھری اور بچوں کے معمولی کھلونے، کلہاڑی، گلاس وغیرہ کے بدلے میں سونا اور ہاتھی دانت حاصل کر کے بہت فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے اور ملک گنی میں غلاموں کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں ہے جب کہ ملک برازیل میں اس پر پابندی لگی ہوئی تھی۔

ایک دن میرے پاس تین مالدار بیوپاری آئے۔ ان بیوپاریوں کی میری ہی طرح بڑی کھیتی باڑی تھی اور انھیں کھیتوں میں کام کرنے کے لیے غلاموں کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ کھلے عام غلاموں کی خرید و فروخت نہیں کرسکتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہم لوگ ملک گنی سے غلام خرید کر لائیں اور آپس میں بانٹ لیں۔ انھوں نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اس کام کو انجام دوں۔ سفر کا سارا خرچ وہ لوگ اٹھائیں گے اور جو غلام میرے حصے میں آئیں گے ان کی قیمت بھی وہ مجھ سے نہیں لیں گے۔

یہ شرط میرے لیے بڑی پُرکشش تھی۔ میں نے اس کو منظور کرلیا اور ان سے کہا کہ میری غیر موجودگی میں میرے کھیت اور کاروبار کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ان پر ہوگی۔ یہی نہیں میں نے ایک وصیت بھی لکھ دی کہ اگر خدانخواستہ میں مرجاؤں تو میری جائیداد اس جہاز کے مالک کو دے دی جائے جس نے میری جان بچائی تھی۔ اس جائیداد کے منافع میں سے آدھا وہ اپنے پاس رکھے اور آدھا لندن بھیج دے۔

میں نے زیادہ کمانے کی فکر میں بہت نقصان اٹھایا۔ حال پر قناعت نہ کی اور صرف مستقبل کے چکر میں پڑ کر سمندر کا سفر اختیار کیا۔ جہاں سے مجھے ہمیشہ مصیبتیں ملیں۔

وہ یکم ستمبر سن 1659 کا منحوس دن تھا، جب میں نے اس سفر کی ابتدا کی۔ یہ وہی منحوس تاریخ تھی جب کہ آٹھ سال پہلے میں نے اپنے گھر، اور ماں باپ کو چھوڑ کر پانی کے جہاز پر قدم رکھا تھا اور مصیبتوں کو دعوت دی تھی اور اب ان دیکھی مصیبتیں پھر میرا انتظار کر رہی تھیں۔

میرا جہاز تیار تھا، اس پر تین ہزار من بوجھ لدا ہوا تھا۔ چھ توپیں اور چودہ نوکر تھے اس کے علاوہ جہاز کا کپتان، اس کا بیٹا اور میں تھا۔ تجارت کے سامان میں کاخری باشندوں کے لیے چھوٹی چھوٹی چیزیں

مثلاً چاقو، چھری، گلاس اور کھلونے وغیرہ تھے۔

بارہ دن میں ہم نے آٹھ سو میل کا فاصلہ طے کرلیا۔ ایک دن ایک خوفناک طوفان نے ہمیں گھیر لیا۔ بارہ روز تک سخت آندھی چلتی رہی۔ ہر وقت جہاز کے ڈوبنے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ ایک ملاح بیمار ہو کر مر گیا۔ ہم نے اس کو سمندر میں ڈال دیا۔ آخر طوفان کا زور کم ہو گیا لیکن ہمارا جہاز صحیح راستے سے بھٹک گیا تھا۔ کپتان کا خیال تھا کہ ہمیں برازیل واپس چلنا چاہیے۔ لیکن میں اس پر راضی نہیں ہوا۔ کپتان نے نقشہ دیکھ کر بتایا کہ کاربین Carabian جزیروں کے سوائے کہیں اور انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ ہم نے شمال مغرب کی سمت سفر جاری رکھا۔ پندرہ دن میں ہم باربیڈوز Barbados جزیرے تک پہنچے۔ ہمارا ارادہ اب افریقہ جانے کا تھا۔ لیکن جہاز کی مرمت کرنا تھی اور جہازیوں کو آرام کی ضرورت تھی اس لیے یہاں ٹھہرنا ضروری تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر ہم شمال مغرب کی طرف کچھ اور آگے بڑھ چلیں تو کسی انگریزی جزیرے سے ہمیں مدد مل جائے گی۔ ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ابھی ہم صرف ساٹھ ستر میل ہی چلے ہوں گے کہ تیز آندھی چلنے لگی اور ہمارا جہاز مغرب کی طرف چل پڑا۔ یہاں آدم خوروں کی بستیاں تھیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ آدم خور ہمیں دیکھتے ہی ہم پر ضرور ٹوٹ پڑیں گے اور پھر ہمیں کھا جائیں گے۔ ہمارا جہاز ہوا کے رحم و کرم پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک صبح ملاح چلایا ''زمین! زمین!''

ہم اندر سے دوڑتے ہوئے نکلے کہ یکا یک ہمارا جہاز ایک دھکے کے ساتھ ریت پر چڑھ گیا۔ ہم پر یہ دوسری مصیبت آن پڑی۔ ایک تو پہلے ہی سمندر میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ سب کو اپنی جانوں کی فکر پڑنے لگی۔ اس وقت کا حال بیان سے باہر ہے کیوں کہ جو کچھ ہم پر بیت رہی تھی اس کو تو وہی جان سکتا ہے جس پر کبھی ایسی مصیبت پڑی ہو۔

اس وقت یہ معلوم ہوا جیسے کہ جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور ہم زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ جہاز کے پیچھے ایک کشتی بندھی ہوئی تھی، یہ کشتی بھی ہوا کے زور سے جہاز سے ٹکرا کر ٹوٹ چکی تھی۔ ایک دوسری کشتی جہاز کے اوپر تھی لیکن اس کا اوپر سے اتارنا ناممکن سا تھا کیوں کہ ہر وقت جہاز کے چر چرا کر ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن جب کوئی دوسری ترکیب سمجھ میں نہیں آئی تو سب نے مل کر اوپر سے لا کر کشتی کو بڑی مشکل سے پانی میں اتارا۔ اور سب لوگ اس پر سوار ہو گئے۔

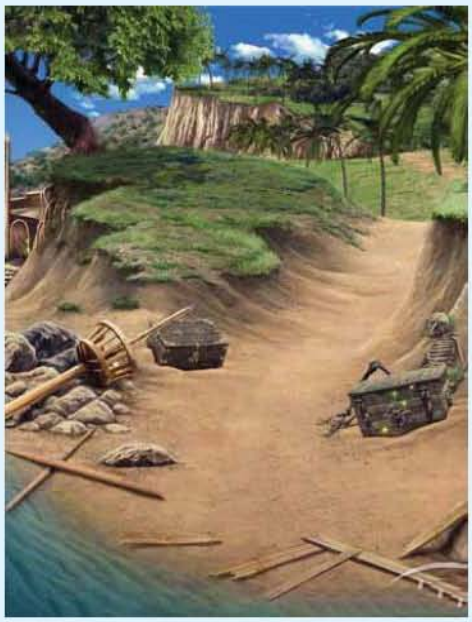

اونچی اونچی موجوں کے سامنے کشتی کا ٹھہرنا ناممکن تھا۔ ہر طرف موت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ ہم نے موجوں کے رحم و کرم پر کشتی چھوڑ دی۔ ہمیں یقین تھا کہ اول تو ہماں کشتی کنارے تک پہنچ نہ سکے گی اور اگر پہنچ بھی گئی تو کنارے کی چٹانوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ ہم نے اپنی جانوں کو خدا کے سپرد کر دیا۔

ایک اونچی موج نے ہماری کشتی کو الٹ دیا اور پانی کو ہماری قبر بنا دیا۔ حالانکہ میں ایک اچھا تیراک تھا لیکن میرے ہاتھ پیر میرے قابو میں نہ تھے اور پھر سمندر بھی بپھرا ہوا تھا۔ ایک موج نے مجھے کنارے پر لا کر پھینک دیا۔ میری ناک اور منہ میں پانی بھر گیا اور میں ادھ مرا پڑا رہا۔ بڑی دیر تک میں اسی حالت میں رہا اور جب میری طبیعت ذرا سنبھلی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے دور تک سمندر ہی سمندر تھا اور میں ساحل پر بے یار و مددگار، اکیلا بھوکا پیاسا بیٹھا تھا! □ جاری

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

• یہ ایک ایسا دل دوز واقعہ ہے جسے سن کر انسان کی روح کانپ اٹھے۔ مگر ظالموں کے ہاتھ نہیں کانپے۔ تاریخ 4 مارچ 2013۔ اتر پردیش میں تین سال کا معصوم بچہ جو بے چارہ ابھی ٹھیک سے بول بھی نہیں پاتا تھا، لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑتا رہا، روتا رہا، گڑگڑاتا رہا۔ اس کی چیخوں سے زمین و آسمان لرز گئے مگر سگے ماں باپ اور بھائی

نے ایک نہ سنی اور بڑی ہی بے دردی سے زبردستی استرے سے اس کا سر منڈوا دیا۔ صرف اس لیے کہ شہر میں سخت گرمی پڑ رہی تھی!
یہ عبرت انگیز واقعہ غور سے پڑھنے کے لیے شکریہ!!

ماہ وش زویریہ، بیڈ

لوگ کہتے ہیں اگر اچھے لوگوں کو یاد کیا جائے تو وقت اچھا گزرتا ہے۔ سوچا آپ کو میں اپنی یاد دلا دوں!

نیلوفر، اورنگ آباد

• سات سُروں میں آپ بھی چھپے ہیں۔

1 س sa
2 ر re
3 گ ga
4 م ma
5 پ pa
6 دھ dha
7 ن ni

خود کو پہچاننے کے لیے بس 3 اور 6 کو ملا کر تان لگائیے!

آفرین فاطمہ چکل تھانہ

• سوچو اگر ڈاکٹر فلم بناتے تو فلموں کے نام کیا ہوا کرتے؟

کبھی کھانسی کبھی زکام
کہو نا بخار ہے

ٹی بی نمبر ون
ہم بلڈ دے چکے صنم
رہنا ہے اب اسپتال میں
بچنا اے مریضو
دل تو کمزور ہے
ایک حسینہ دو کڈنی

عبدالرحمٰن انصاری، دھولے، دیوپور

• بیوی: آج سنڈے ہے، لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔ اور خوش ہو جاؤ، ڈرائیونگ میں کروں گی؟
شوہر: یعنی ہم جائیں گے کار میں اور آئیں گے کل اخبار میں

راسخ احمد انصاری، دھولے، دیوپور

• پپو: پاپا میں کب تک اتنا بڑا ہو پاؤں گا کہ ممی سے پوچھے بغیر گھر سے جا سکوں؟
پاپا: پتہ نہیں بیٹا! ابھی تو میں خود اتنا بڑا نہیں ہوا ہوں

زوہا فاطمہ، ناندیڑ

• ٹیچر: اہنسا یعنی عدم تشدد کا مطلب جانتے ہو؟
گپو: خوب جانتے ہیں سر!

ٹیچر: ٹھیک ہے۔ اس کا ثبوت دو
گپو: جب آپ ہمیں مارتے ہیں ہم آپ کو کچھ نہیں کہتے۔

• گولو: اسٹیشن جانے کا کیا لوگے؟
رکشا والا: 50 روپے
گولو: 20 لے لو
رکشا والا: بھلا 20 میں کون لے جاتا ہے؟
گولو: تم پیچھے بیٹھو۔ میں لے جاتا ہوں۔

• سدھو: یار سر کا میسیج آیا ہے، آج ایکسٹرا کلاس ہوگی۔ کیا کروں؟
گپتا: لکھ کر بھیج دے، میسیج سینڈنگ فیلیر Message Sending Failure

• سنتا: تیری بیوی مرگئی تو تو نے اپنی سالی سے شادی کر لی۔ مگر سالی سے ہی کس لیے؟
بنتا: اس لیے کہ اب نئی ساس کو جھیلنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے!

• پپّو بیڈ پر الٹا لٹکا ہوا تھا۔ ببلو نے پوچھا: یہ کیا کر رہے ہو؟
پپّو نے جواب دیا: میں نے سر درد کی گولی کھائی ہے۔ کہیں پیٹ میں نہ چلی جائے۔

• ببلو مرغی کے مرجانے پر رو رہا تھا۔ پپّو نے کہا "بس کرو یار! اتنا تو میں اپنے والد صاحب کے مرنے پر بھی نہیں رویا تھا!"
"تو تمھارے والد انڈا تھوڑا ہی دیتے تھے!" ببلو نے جواب دیا۔

• موہن: اگر تیری بیوی پر بھوت آجائے تو پھر تو کیا کرے گا؟
سوہن: مجھے بھلا کیا کرنا ہے؟ غلطی بھوت کی ہے۔ وہ خود بھگتے گا!

شکیب انور مومن، مالیگاؤں، ناسک

• زندگی میں دو باتیں ضرور یاد رکھیے۔
ایک: جب بھی غصہ آئے تو فوراً کوئی فیصلہ مت کیجیے
دو: جب بہت خوش ہوں تو کوئی وعدہ مت کیجیے!

نام نہیں لکھا

• ایک دوست دوسرے دوست سے: تمھارے سر پر یہ چوٹ کیسے لگی؟
دوسرا دوست: وہ ذرا بیوی نے پھول کھینچ کر مار دیے تھے۔
پہلا دوست: ارے! مگر پھولوں سے اتنی گہری چوٹ کہاں لگتی ہے؟
دوسرا دوست: دراصل پھول اس نے گلدان سمیت مارے تھے!

محمد عامر عثمان، پیر برہان گلی نمبر 7، ناندیڑ

• ایک 60 سال کے شخص نے اخبار میں شادی کے لیے اشتہار دیا، 'رشتے کی ضرورت ہے'
دوسرے دن کسی کا فون آیا۔ "انکل جی، اس عمر میں رشتے نہیں فرشتے آتے ہیں۔"

• ویٹر: صاحب کیا لیں گے؟
گاہک: ایک پلیٹ کوفتے۔
ویٹر: اور کچھ سر!
گاہک: ہاں، اگر کوفتے پہلے جیسے ہوں تو ایک ہتھوڑا بھی لیتے آنا۔

• ایک شرابی رات کو 3 بجے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں پولیس والے نے پکڑ لیا اور پوچھا: کہاں جا رہے ہو اس وقت؟
شرابی: شراب کے نقصانات پر تقریر سننے جا رہا ہوں...

پولیس والا: واقعی؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مگر اتنی رات میں بھلا تقریر کرے گا کون؟

شرابی: میری بیوی اور کون!؟

• لڑکی: میں جب بھی تمھیں فون کرتی ہوں تم شیونگ کر رہے ہوتے ہو۔ دن میں کتنی بار شیونگ کرتے ہو؟

لڑکا: تیس چالیس بار!

لڑکی: پاگل ہو کیا؟

لڑکا: نہیں، حجام!

• بیوی: اگر میں مر گئی تو کیا ہوگا؟

شوہر: میں پاگل ہو جاؤں گا۔

بیوی: تو کیا تم دوسری شادی نہیں کرو گے؟

شوہر: پاگل کچھ بھی کر سکتا ہے۔

• ٹیچر: بتاؤ اس جملے کا کیا مطلب ہوا؟ آئی ول کال یو لیٹر

I Will Call You Later

اسٹوڈنٹ: سر اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تمھیں کال کروں گا اور تم مجھے لیٹر لکھو گے۔

• شادی سے پہلے:

لڑکی: بتاؤ چاند کہاں ہے؟

لڑکا: ایک تو وہ ہے آسمان میں اور دوسرا میرے سامنے ہے۔

شادی کے بعد:

لڑکی: بتاؤ چاند کہاں ہے؟

لڑکا: اندھی ہے کیا؟ دکھائی نہیں دیتا؟ وہ آسمان میں کیا تیرا باپ سی ایف ایل CFL لیے بیٹھا ہے؟

ابرار مرزا بیگ، اورنگ آباد

• ایک کنجوس: یہ دیکھو میری چائے میں مکھی گر گئی ہے!

دوسرا کنجوس: صبر کرو یار، ایک مکھی زیادہ سے زیادہ کتنی چائے پی لے گی؟ مشکل سے ایک بوند!

فراز احمد، مالیگاؤں

• تین پاگل کہیں جا رہے تھے۔ ایک کا نام تھا کیا، دوسرے کا کیوں اور تیسرے کا دماغ! راستے میں دماغ نے کہا، یارو مجھے بیت الخلا جانا ہے۔ تم ذرا یہیں ٹھہرو میں ابھی فارغ ہو کر آتا ہوں۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا وہاں آیا اور پہلے پاگل سے بولا، ''تمھارا نام کیا ہے''

پاگل نے جواب دیا، ''کیا!'' بوڑھے نے پھر پوچھا۔ اس نے پھر کہہ دیا، ''کیا'' تب بوڑھے نے دوسرے پاگل سے نام پوچھا۔ دوسرے نے کہا، ''کیوں!'' بوڑھے نے پھر پوچھا تو اس نے پھر وہی جواب دیا۔ آخر بوڑھے نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تمھارا دماغ کہاں چلا گیا ہے؟''

دونوں پاگلوں نے ایک ساتھ جواب دیا: ''بیت الخلا!''

ذاکر مستقیم ملک، دھولے

• ایک سال بے تحاشہ بارش ہوئی۔ ایک محفل میں کسی نے کہا، ''لگتا ہے زمین میں جو کچھ اب تک اندر گیا ہے، وہ سب باہر نکل آئے گا۔''

یہ سنتے ہی ملا نصر الدین گھبرا گئے۔ ایک شخص نے گھبراہٹ کا سبب پوچھا تو ملا نصر الدین بولے، ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر میری تینوں مرحوم بیویاں باہر نکل آئیں تو کیا ہوگا؟''

عظمیٰ سمرین، ناندیڑ

• دو آدمی ریلوے اسٹیشن پر آئے تو دیکھا گاڑی چل پڑی ہے۔ دونوں گاڑی کے پیچھے دوڑ پڑے۔ گارڈ نے یہ دیکھا تو ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا، مگر دوسرا رہ گیا۔ جو چڑھ گیا تھا وہ حیران ہو کر بولا، ''معاف کیجیے گارڈ صاحب جانا اسے تھا جو پلیٹ فارم پر رہ گیا ہے، میں تو صرف اسے اسٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا!''

نور جہاں عبدالغنی، مالیگاؤں

• ہاہا
ہاہاہا
ہاہاہاہا
ہاہاہاہاہا
ہاہاہاہاہاہا
ہاہاہاہاہاہاہا
ہاہاہاہاہاہاہاہا

کچھ نہیں، بس ذرا آپ کی شکل یاد آگئی تھی!

حسیب احمد، پھول پور، الہ آباد

• اگر آپ غریب پیدا ہوئے ہیں تو اس میں قدرت کا کوئی قصور نہیں۔ لیکن اگر آپ غریب مرتے ہیں تو یہ آپ کا قصور ہوگا!

مدثر، مالیگاؤں، ناسک

• خدا تمھاری برائیوں کو Delete کردے
تمھاری نیکیوں کو Save کردے
تمھاری حق گوئی کو Life Time کردے
تمھاری روح میں ہمیشہ کے لیے رحم دلی Activate کردے
آمین، ثم آمین

سومیہ خان، اورنگ آباد

• مالک کا آئینہ ٹیڑھا میڑھا تھا۔ اس نے سنتا سے کہا، ''کوئی ایسا آئینہ لے کر آؤ جس میں مجھے اپنی شکل ٹھیک دکھائی دے۔''
سنتا کافی دیر بعد خالی ہاتھ لوٹا اور بولا، ''نہیں ملا سر! جس آئینے میں بھی دیکھا مجھے اپنی ہی شکل دکھائی دی۔''

نام پتہ نہیں لکھا

• اگر آپ جھوٹ بولتے ہیں اور آپ کے دل میں محبت نہیں تو آپ کے ایک ہفتے کے سات دن یہ ہوں گے:

Sinday
Mourn day
Tearsday
Wasteday
Thirstday
Fightday
اور Shatterday

نامعلوم

• باپ بیٹے سے: ہمیشہ دل لگا کر پڑھا کرو
بیٹا: ٹھیک ہے ابّو، لیکن آپ تو چشمہ لگا کر پڑھتے ہیں؟

عظمیٰ خان، انجان گاؤں، امراوتی

• ایک شخص نے بوڑھے فقیر سے کہا، ''بابا آپ پیدل چلتے چلتے تھک جاتے ہوں گے۔''

فقیر بولا، ''ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔''
اس شخص نے کہا، ''تو پھر کوئی سستی سی سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے۔''
فقیر نے کہا، ''سائیکل کیا چیز ہے بیٹا، چاہوں تو آج ہی ایک عمدہ کار خرید لوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کار چلاؤں گا تو پھر مجھے لوگ بھیک نہیں دیں گے!

عیسیٰ عادل، ریاض، سعودی عرب

ضروری بات

کئی بچوں نے پوچھا ہے کہ کیا وہ اس کالم کے لیے مذہبی میسیج بھیج سکتے ہیں؟ کیوں نہیں، ضرور بھیجیں۔ مگر ان میں کچھ ایسی باتیں ہونی چاہئیں جو ہر مذہب یا عقیدے کے لوگوں کے کام آئیں۔ کچھ بچوں نے شعر و شاعری شامل کرنے کا مشورہ دیا ہے تو ایسی چیزیں بھی بھیج سکتے ہیں مگر ان کے وزن اور بحر کا ٹھیک ہونا ضروری ہے۔ مدیر اعلیٰ

ادارہ

بچوں کے لیے

کیلاش ستیارتھی اور ملالہ یوسف زئی کو نوبیل انعام

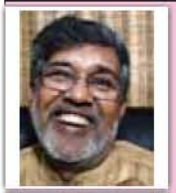

دنیا کا سب سے بڑا عالمی اعزاز سمجھے جانے والے نوبیل پرائز کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع ہے جب بچّوں کی بھلائی کا کام کرنے کے لیے دولوگوں کو ایک ساتھ یہ انعام دیا گیا ہے اور انعام پانے والوں میں 17 سال کی لڑکی ملالہ یوسف زئی شامل ہے جو کہ اب تک کی سب سے کم عمر نوبل پرائز وِنر ہے۔ ہندوستان کے کیلاش ستیارتھی (عمر 60 سال) کو یہ انعام بچّوں کو ظلم و زیادتی اور بچّہ مزدوری سے نجات دلانے اور تعلیم کو ہر بچّے کا حق منوانے کی تحریک چلانے کے لیے دیا گیا ہے۔ وہ ایک الیکٹرک انجینئر ہیں اور بچّہ مزدوری کے خلاف لڑنے کے لیے انھوں نے 1980 میں نوکری چھوڑ دی تھی۔ ان کی بدولت ملک کے ہزاروں بچوں کو مزدوری سے نجات ملی اور اب وہ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ پاکستان کی ملالہ یوسف زئی کو لڑکیوں کی تعلیم کی حمایت کرنے پر 'طالبان' دہشت گردوں نے 2012 میں گولی ماردی تھی کیونکہ جب وہ 11 سال کی عمر سے بی بی سی کی اردو سروس کے لیے بلاگ لکھ کر عورتوں کو پڑھائی لکھائی سے دور رکھنے کی طالبان کی کوششوں کی مخالفت کررہی تھی۔ زخمی ملالہ زندگی اور موت کے بیچ جھولتی رہی اور آخرکار لندن کے ایک اسپتال میں اس کا علاج ہوا۔ اس سال اس نے ایک 'اسلامی' انتہا پسند گروہ، 'بوکوحرم' کے ہاتھوں 200 اسکولی لڑکیوں کے اغوا کے خلاف آواز اٹھائی اور نائجیریا جاکر ان بچّیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس نے ایک 'ملالہ فنڈ' قائم کیا ہے جس سے وہ پاکستان، نائجیریا، جارڈن، شام اور کینیا میں بچّوں کی تعلیم کے لیے کام کرنے والے گروپوں کی مدد کررہی ہے۔

ہرن کے بچّے کی جان بچانے والا بلال

بنگلہ دیش کے نواکھالی ضلع میں سیلاب کے دوران ایک لڑکے بلال نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہرن کے بچّے کو بچا لیا۔ لوگوں کو خود بلال کے بچنے کی امید نہیں تھی کیونکہ وہ پوری طرح ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن وہ بھی بچ گیا اور ہرن کا بچّہ بھی! مقامی فوٹوگرافر حسیب الوہاب نے اس کی تصویریں کھینچ لیں

بشکریہ آئی بی این لائیو

گاؤں کے بچّے کتنے قابل؟

ایک والنٹیر (رضا کار) گروپ، پرتھم Pratham ان دنوں گاؤں دیہات میں یہ جاننے کی کوشش کررہا ہے کہ بچّے پڑھائی میں کتنے پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس گروپ کے نوجوان والنٹیر گاؤں میں جاکر کسی بھی مکان پر دستک دیتے ہیں وہاں رہنے والے 6 سے 16 سال تک کے بچّوں سے ملتے ہیں، اور انھیں ان کی زبان کا ایک پرچہ پڑھنے کو اور ایک حساب کا پرچہ سوال حل کرنے کو دیتے ہیں۔ اس طرح یہ رضا کار اکتوبر اور نومبر کے دوران چھ سات لاکھ بچّوں کا ٹیسٹ لے کر ایک رپورٹ تیار کریں گے جو 'اثر' یا ASER یعنی Annual Status of Education Report (تعلیم کا سالانہ جائزہ) کہلاتی ہے۔ یہ گروپ دس سال سے یہ کام کررہا ہے۔ بشکریہ 'اثر' سینٹر انڈیا

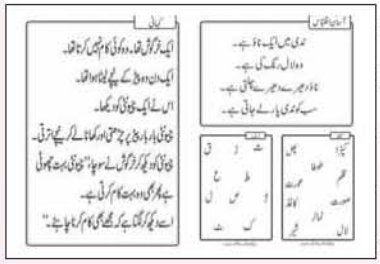

ادارہ

بچوں کی ان تحریروں میں کافی پختگی ہے۔ صاف ظاہر ہے ان میں بڑوں سے مدد لی گئی ہے۔ کلاس وغیرہ کا ذکر بھی نہیں کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ کام کی تحریریں ہیں اس لیے ہم نے شامل کر لی ہیں۔ لیکن آئندہ اپنے اسکول اور تحریر میں مدد کرنے والے کا نام ضرور لکھیں۔

وہاں کون سا گارڈ ہوگا

مولانا اشرف علی تھانوی کی طرف سے اپنے سارے مریدین اور متعلقین کو ہدایت تھی کہ جب کبھی ریلوے میں سفر کرو، اور تمھارا سامان اس مقدار سے زائد ہو، جتنا ریلوے نے تمھیں مفت لے جانے کی اجازت دی ہے، تو اس صورت میں اپنے سامان کا وزن کراؤ اور زائد سامان کا کرایہ ادا کرو، پھر سفر کرو۔ خود حضرت والا کا اپنا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سفر کے ارادے سے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی آنے کا وقت قریب تھا، آپ اپنا سامان اس دفتر میں پہنچے جہاں پر سامان کا وزن کرایا جاتا تھا اور جا کر لائن میں لگ گئے۔

اتفاق سے گاڑی کا گارڈ وہاں آ گیا اور حضرت والا کو پہچان کر بولا ''حضرت آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟''

حضرت نے فرمایا ''میں سامان کا وزن کرانے آیا ہوں۔''

گارڈ نے کہا ''آپ کو سامان کا وزن کرانے کی ضرورت نہیں، آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں آپ کے ساتھ گاڑی میں جا رہا ہوں۔ آپ کو زائد سامان کا کرایہ دینے کی ضرورت نہیں۔''

حضرت نے پوچھا ''تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے؟''

گارڈ نے کہا ''میں بیچ کے اسٹیشن تک جاؤں گا۔''

حضرت نے پوچھا ''اس کے بعد کیا ہوگا؟''

گارڈ نے کہا ''اس اسٹیشن پر دوسرا گارڈ آئے گا، میں اس کو بتا دوں گا یہ حضرت کا سامان ہے، اس کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ مت کرنا۔''

حضرت نے پوچھا ''وہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟''

گارڈ نے کہا ''وہ تو اور آگے جائے گا، اس سے پہلے ہی آپ کا اسٹیشن آ جائے گا۔''

حضرت نے فرمایا ''مگر میں تو اور بھی آگے جاؤں گا (یعنی آخرت کی طرف) اور پھر اپنی قبر میں جاؤں گا۔ وہاں پر کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا؟ جب وہاں آخرت میں مجھ سے سوال ہوگا کہ ایک سرکاری گاڑی میں سامان کا کرایہ ادا کیے بغیر جو سفر کیا اور جو چوری کی اس کا حساب دو، تو وہاں پر کون سا گارڈ میری مدد کرے گا؟''

تحریر: عاطف احسن
گجری بازار کامٹی، ضلع: ناگپور

اس نے کی شرارتوں سے توبہ

وہ بہت شریر تھا۔ عام الفاظ میں اسے مصیبت کہا جا سکتا تھا۔ بچہ ہو یا بوڑھا ضعیف، جانور ہو یا پرندہ کوئی بھی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں تھا۔ گھر پر ہر وقت کوئی نہ کوئی شکایتی ضرور ہوتا۔ نام تو اس کا جنید تھا مگر کام، اللہ کی پناہ۔ کسی کو پتہ چل جائے کہ جہاں وہ ہے وہاں سے جنید بھی گزرے گا تو وہ فوراً کسی جن کی طرح غائب ہو جاتا۔ ایسے میں رونا پڑتا تو درختوں یا پودوں کو جو بے چارے اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے۔

بے زبان جانوروں اور محتاجوں کو تنگ کرنا تو پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کبھی اندھے فقیر کی لاٹھی چھین لی تو کبھی بکری کو دو ٹانگوں پر کھڑا کر دیا۔ کبھی معصوم چڑیا کے پیر میں دھاگا باندھ کر پتنگ کی طرح اس وقت تک اڑایا جب تک اس کی ٹانگ نہ ٹوٹ جائے۔ درخت سے پھل توڑ لیے یا سارے پتے نکال کر اسے برہنہ کر دیا۔ استاد کی چھڑی توڑ دی تو کبھی استاد کے بیٹھتے وقت کرسی کھینچ لی۔ ننھی بیر بہوٹی

کو مسالے کی طرح سل پر پیس ڈالا۔ مرغی کے چوزوں کو گیند کی طرح ہوا میں اچھال دیا۔ مینڈک کی ٹانگ لکڑی سے باندھ کر اسے جھلانا شروع کر دیا۔ کبھی کسی کھڑی کے کانچ توڑ دیے تو کبھی کسی کی لائٹ توڑ ڈالی۔ کسی کی سائیکل کی ہوا نکال دی۔ کسی کے بندھے بیل کھول دیے۔ کسی کے گھر پر پتھر پھینکا تو کسی کے اوپر گندا پانی۔ ہر وہ کام جسے اچھے لوگ برا سمجھتے ہیں وہ جنید کو پسند تھا۔ پڑھائی سے تو

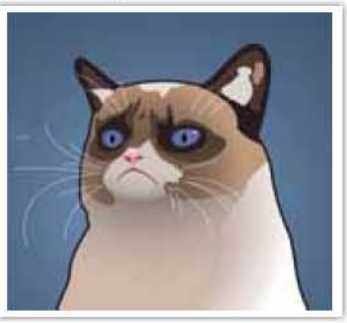

بس اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ہر کام میں جنید میاں کا چھوٹا بھائی ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ امّی سمجھا سمجھا کر تھک گئیں۔ لاکھ مارا پیٹا مگر جنید کی موٹی چمڑی پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ جنید نانی کے گھر گیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات میں سب لوگ چھت پر تھے جنید کو بیٹھے بیٹھے گلی ڈنڈا کھیلنے کا خیال آیا۔ پھر کیا تھا سبھی بچے اس کے ساتھ لگ گئے۔ جنید نے گلی کو ایسا ڈنڈا مارا کہ سیدھی نانا کے سر پر جا لگی۔ پھر تو اس کی شامت آ گئی۔ امّی نے روئی کی طرح دھنک ڈالا مگر کچھوے کی کھال پر تلوار کا کیا اثر!

ایک روز امّی کی دور کے رشتے کی ایک خالہ آئی ہوئی تھیں۔ نام تھا ان کا گینڈا۔ جنید نے یہ سنا تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ جب ہم کالج سے گھر آئے تو جنید دور سے ہی چلایا، ”آپی گھر میں گینڈا آ گیا۔“

”گینڈا“ ہم نے تعجب سے پوچھا، ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جنید میاں نے جو تشریح کی اس پر ہنسی تو بہت آئی مگر کنٹرول کر لیا اور بناوٹی غصے سے کہا ”جنید یہ کیا ہے... نانی ہے وہ تمہاری، ہمارے رسولؐ نے کسی کے نام کو بگاڑنے سے منع کیا ہے۔“ مگر وہاں کچھ اثر ہی نہیں تھا۔

ایک مرتبہ بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ گھر کی بلی ایک طرف بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ پتہ نہیں جنید کے دل میں کیا خیال آیا کہ خود ہی مسکرانے لگا اور مرغیوں کے ڈربے کی طرف چل دیا۔ جب واپس آیا تو ہاتھ میں مرغی کا ننھا سا چوزا تھا۔ چوزے کو وہ بلی کے منہ کے سامنے لے گیا۔ جب بلی اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھی تو جنید نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ کم از کم دس منٹ تک یہ کھیل چلتا رہا میاں جنید مزہ لیتے رہے۔ اب بلی کو کافی غصہ آیا۔ اور آتا کیوں نہیں۔ مسلسل کوشش کے بعد ناکام جو ہو رہی تھی۔ چنانچہ اگلی بار بلی نے چوزہ پکڑنے کی کوشش میں جنید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر کیا تھا۔ چلا چلا کر جنید نے سب کو جمع کر لیا۔ بلی کو تو گویا وہ ہاتھ چوزے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ اس ہاتھ چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ جنید میاں کے چچا نے ایک موٹی سی لکڑی بلی کو اس زور سے ماری کہ بے چاری دھم سے گر کر بے ہوش ہو گئی۔

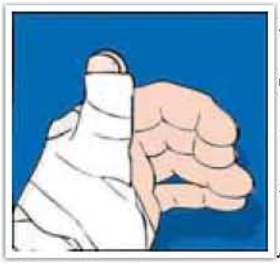

بعد میں ڈاکٹر نے دو انجکشن لگائے تب جنید کے ہوش ٹھکانے آئے۔ بس اسی وقت جنید نے ہمیشہ کے لیے شرارتوں سے توبہ کر لی۔ ڈاکٹر نے ہاتھ پر پٹی بندھوانے کے لیے دوبارہ آنے کو کہا تو جنید کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہہ نکلے۔ شرمندگی سے یا تکلیف سے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے!

تحریر: نورالسلام معرفت اسد خاں،
کھڑگپور بری ٹاکلا ضلع اکولہ۔ 444401

آپ کی باتیں

اردو Facebook

□ انکل آداب! ہمیں 'بچوں کی دنیا' سے ایک عجیب سی انسیت ہوگئی ہے۔ بہت کم وقت میں یہ رسالہ ہمارے سارے گھر کا پسندیدہ رسالہ بن گیا ہے۔ رسالہ کے لیے دو لطیفے روانہ کر رہا ہوں۔

ماں: (بیٹے سے) تم امتحان میں فیل کیوں ہوگئے؟

بیٹا: امی! میں بھول گیا تھا کہ جاپان، چین اور نیپال کہاں ہے۔

ماں: بیٹا! اسی لیے کہتی ہوں کہ اپنی چیزیں سنبھال کر رکھا کرو۔

• ایک شاعر نے ایک رسالے میں نظم بھیجی عنوان تھا 'میں زندہ کیوں ہوں' پندرہ دن بعد رسالے کے ایڈیٹر کا خط آیا، جس میں لکھا تھا ''آپ اس لیے زندہ ہیں کہ آپ نے یہ نظم ڈاک سے بھیجی۔

مازن اشہر نہال احمد اے ٹی ٹی ہائی اسکول، مالیگاؤں

□ انکل! میں عدنان ارشد، درجہ چہارم کا طالب علم ہوں۔ میں پچھلے ایک سال سے بچوں کی دنیا کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ فسانہ عجائب مجھے بہت پسند تھا۔ میں ایک نظم لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب لکھ لوں گا تو آپ کے میگزین کے لئے بھیج دوں گا۔ میں اپنے دوستوں کو بھی یہ میگزین پڑھنے کے لیے دیتا ہوں۔ سبھی اردو والوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بچوں کی دنیا ضرور جاری کروائیں۔ تاکہ اردو ہمارے بیچ زندہ رہے اور فروغ پاتی رہے۔

عدنان ارشد سلفیہ جونیئر اسکول، دربھنگہ، بہار

□ میرا نام ارمغان اصغر ہے۔ میری عمر 10 سال ہے اور میں چوتھی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ میں 'بچوں کی دنیا' کو اس کے پہلے شمارے سے ہی پڑھتا آ رہا ہوں۔ 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کے ساتھ ساتھ

گھر میں بہت سارے اردو کے رسالے اور اخبارات آتے ہیں۔ میرے نانا فیروز عابد اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ چھوٹے نانا مسلم نواز مشہور شاعر ہیں۔ ماموں اعجاز فیروز کہانیاں لکھتے ہیں اور پاپا اصغر شمیم بھی اچھے شاعر ہیں۔ گھر میں صرف اور صرف اردو کا ماحول ہے۔ میری امی کے نام پر 'عطیہ اردو' یہاں کے اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ مجھے کہانیاں سننا اور پڑھنا بہت پسند ہے میں نے اپنے پاپا سے قصہ چہار درویش سنا ہے اور اب خود پڑھتا ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' کی کہانیاں اور نظمیں مجھے بہت پسند آتی ہیں۔ تصویر بنانے اور نظمیں لکھنے کا بھی شوق ہے۔ میں بھی اپنے نانا کی طرح اردو کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

ارمغان اصغر، درجہ چہارم ابوالحسن ہائی اسکول

37 مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کولکاتا-700073

خط پڑھ کر اچھا لگا۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ 'عطیہ اردو' کیا چیز ہے؟ موقع ملے تو لکھیں

□ انکل! میرا نام بسمہ رانی ہے۔ میری عمر چار سال ہے۔ ابھی میں پڑھ لکھ نہیں پاتی۔ لیکن بچوں کی دنیا میں چھپی تصویریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں اپنی مما سے کہانیاں پڑھوا کر سنتی ہوں۔ جلدی جلدی پڑھنا لکھنا سیکھ رہی ہوں۔ پلیز میرا خط چھاپ دیجیے گا۔ میں نے بہت تیار ہو کر فوٹو کھنچوائی ہے۔ خط کے ساتھ تصویر ضرور چھاپیں۔

بسمہ رانی، چندن بارہ، مشرقی چمپارن، بہار

ضروری بات: اس کالم کے لیے تصویر صاف ستھری ہونی چاہیے۔ تصویر کے نیچے اپنا نام ضرور ٹائپ کریں یا لکھیں۔ کئی بار بڑی الجھن ہوتی ہے کہ کون سی تصویر کس کی ہے!

انوکھے منظر انٹرنیٹ میں

۔آنکھ پر آنکھیں بلی کی!2۔ہاتھی کی قلابازی!دیکھی ہے کبھی؟3،4۔قدرت سے بھول چوک انسانوں میں نہیں جانوروں میں بھی ہو جاتی ہے5۔مرغی کے انڈے کا چھلکا دوبارہ مرغی کے روپ میں ڈھل سکتا ہے، بس ذرا سا ہنر اور تھوڑا سا گوند چاہیے6۔پولینڈ میں یہ الٹا مکان لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں، سیدھا ہوتا تو شاید کوئی نہ آتا7۔خالی وقت میں مرغے فٹ بال نہ کھیلیں تو کیا کریں؟